No. 23-L. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1983

اس پرچہ میں

قرآنی آئین کے بنیادی اصول

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون : ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ ″	خط وکتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	ستمبر ۱۹۸۳ء	شمارہ ۹

فہرست

۱- لمعات ۲
۲- نگہِ بازگشت (رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل) - مرتبہ : محترم محمد اسلام صاحب .. ۵
۳- قرآنی آئین کے بنیادی اصول ۱۷
۴- (کالعدم) جماعتِ اسلامی اور علماء (شاہد عادل) ۴۵
۵- حقائق و عبر : (۱) حق حکومت (۲) ضربِ قرآن! (۳) تبلیغِ اسلام کے نتائج! (۴) شرعی سزائیں! (۵) سود کیا ہے؟ (۶) کمائی اور مہنگائی کی نسبت! (۷) جرائم کی صورتِ حال! (۸) ہمارے کل کے علماء کرام! (۹) اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر! (۱۰) کیا احمدی مسلمان ہیں؟ ۵۷
۶- قرآنی درس کے اعلانات ۶۳

ایڈیٹر : محمد خلیل ، ناشر : شیخ عبدالحمید ، مقامِ اشاعت : ۲۵-بی - گلبرگ ۲ - لاہور - مطبوعہ : اشرف پرنٹنگ پریس ۹ - ایبک روڈ - لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

پاکستان میں برسوں سے "اسلامی نظام" کے الفاظ زبان زدِ خاص و عام ہیں، لیکن ہر اس قوم کی طرح جس کی منزل متعین نہ ہو، ان الفاظ کا مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں۔ کسی نظریہ یا اقدام کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا کوئی معیار مقرر نہیں، اور چند تعزیری قوانین کو "نظام" سمجھ لیا گیا ہے۔ نظام نام ہوتا ہے کسی معاشرہ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا۔ لہٰذا اسلامی نظام کے معنی ہوں گے ایسا معاشرہ جس میں اسلام (یعنی قرآن) کے تقاضے من حیث الکل پورے ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان تقاضوں کا آغاز، اپنے افتتاحیہ (سورۂ فاتحہ) کی پہلی آیت سے کر دیا ہے، جب کہا کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (1/2) خدا کی ذات مرجعِ حمد و ستائش ہے، اس لئے کہ اس نے ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ لے رکھا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کی نشوونما کے لئے جس سامان کی ضرورت ہو اسے مہیا کرنا۔ انسان عبارت ہے اس کے جسم اور ذات (نفس یا خودی) سے۔ اس کی ذات کی نشوونما کا سوال تو الگ ہے، اس کے جسم کی نشوونما کے لئے رزق کی ضرورت ہوتی ہے جس میں انسان کی جملہ طبیعی ضروریات آجاتی ہیں۔

رزق کی ذمہ داری کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاھُمۡ (6/151)۔ "ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔" ذہن میں پیچیدگیاں پیدا کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کو روٹی نہیں ملتی یا اس کی اولاد بھوکی مرتی ہے، تو اس کی ذمہ داری کسی انسان پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ خود انہیں رزق مہیا کر دیتا۔ سنیئے کہ قرآن ایسا کہنے والوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ وَ اِذَا قِیۡلَ لَھُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ۙ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق تمہیں خدا نے عطا کیا ہے اسے دوسرے حاجتمندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کھلا رکھو۔ اس پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جاؤ" قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطۡعَمَہٗۤ ۔ "تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ تم ہم سے کہتے ہو کہ ہم غریبوں کی روٹی کا انتظام کریں۔ اگر منظور ہوتا کہ وہ بھوکے نہ رہیں، تو وہ خود ہی انہیں روٹی کھلا دیتا۔" خدا کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا کہ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (36/47) "ان سے کہو کہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔" آپ نے غور فرمایا کہ خدا نے کیا کہا ہے؟ اس نے یہ کہا کہ خدا کو بھوکوں کی روٹی کا انتظام براہِ راست کرنا چاہیئے، کافرانہ ذہنیت اور گمراہانہ مسلک ہے۔ خدا بھوکوں کو روٹی نہیں کھلایا کرتا۔ وہ اپنی اس ذمہ داری کو انسانوں کے ہاتھوں پوری کراتا ہے۔ اور یہ اس نظامِ مملکت کی اولین ذمہ داری ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہوگیا۔
اور اس کی عملی تفسیر حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ
اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو خدا کے ہاں عمر سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔
اس حقیقت کو اس حدیث میں بڑے دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے جسے (حسن اتفاق سے) صدر مملکت نے اپنے ۱۲ اگست کے خطاب کے آخر میں پیش کیا تھا۔ اس روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ایک شخص سے کہیگا کہ میں بیمار تھا۔ تم میری عیادت کے لئے کیوں نہیں آئے؟ وہ کہیگا کہ الٰہ العالمین! آپ کسطرح بیمار ہوسکتے ہیں۔ جواب ملے گا، میرا فلاں بندہ بیمار تھا۔ تم اس کی تیمارداری کے لئے نہیں گئے تھے۔
ایک اور شخص سے خدا کہے گا کہ میں پیاسا تھا۔ تم نے مجھے پانی پلایا تھا؟ وہ کہیگا۔ باری تعالیٰ آپ کیسے پیاسے ہوسکتے ہیں۔ جواب ملے گا۔ میرا فلاں بندہ پیاسا تھا۔ تم نے اسے پانی نہیں پلایا۔
ایک اور شخص سے وہ کہے گا کہ میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے روٹی کھلائی تھی؟ وہ کہیگا کہ آپ کسطرح بھوکے ہوسکتے ہیں۔ جواب ملے گا۔ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا۔ تم نے اسے روٹی کھلائی تھی؟
یہ ہے کسی نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا معیار! یہ معیار ایسا محسوس اور مرئی ہے جسے اندھے بھی دیکھ سکتے، اور بہرے بھی سن سکتے ہیں۔ اس کے لئے نہ کسی ہدایہ سے مشورہ کرنے کی حاجت ہے، نہ کسی شامی سے فتویٰ لینے کی ضرورت، اس نظام کو دیکھنے کے لئے ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں۔ دیگر مسلم ممالک کو تو چھوڑیئے۔ حریم کعبہ کی فضاؤں تک میں بھی بھیک کے لئے ہاتھ پھیلے دکھائی دینگے۔ علامہ اقبالؒ نے، پاکستان کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ

> اسلامی قانون کے گہرے اور طویل مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اسے عملاً نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد معاشرہ کو روٹی کی ضمانت مل سکتی ہے۔ لیکن اس ملک میں اس اسلامی شریعت کا نفاذ ناممکن ہے جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد ریاست (ایک یا ایک سے زیادہ) مملکتیں نہ ہوں۔ (اقبالؒ کے خطوط بنام جناح صـ۱۶)

وہ مملکت تو بن گئی لیکن اس شریعت کا نفاذ اس میں بھی نہ ہوسکا!

ہم اس موضوع پر ۱۹۳۸ء سے بالعموم اور ۱۹۴۸ء سے بالخصوص لکھتے چلے آرہے ہیں۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ اب وہ کون سا خاص "سرود" ہے جس نے "مستوں" کو اس کی یاد دلادی ہے۔ وہ سرود، نوائے شکوہ نہیں۔ نشیدِ تشکر ہے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے ملازمین سرکار کی تنخواہوں کے نئے سکیلز کا اعلان ہوا ہے تو اس میں ایک ایسی نوید جانفزا دعوۂ نشاط روح ہوئی ہے جس سے ہماری زبان پر بے ساختہ تبریک و تحسین کے الفاظ ابھر آئے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

> پنشنروں کی بیواؤں کو تاحیات پنشن مل سکے گی۔ اگر وہ فوت ہو جائیں تو ان کی نابالغ اولاد سن بلوغ تک پنشن کی حقدار ہوگی۔

امداد زیادہ اہم نہیں۔ لیکن اس جذبہ کی اساس بڑی اہم ہے۔ پنشنرز کی بیوائیں اور بچے (بالعموم) بے سہارا ہوتے ہیں۔ ان کے لئے زندگی بھر کا سہارا مہیا کر دینا، ایک درخشندہ اصول کا پیش خیمہ ہے۔ ہم حکومت کو اس کے اس مستحسن اقدام پر مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔

حکومت نے اپنے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے بھی کئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی اسلامی اقدام نہیں۔ ایسا تو عام سیکولر حکومتیں بھی، انتظامی تقاضوں کی رو سے، کرتی رہتی ہیں۔ اس میں اسلامی رنگ آ سکتا ہے، بشرطیکہ (جیسا کہ پرویز صاحب نے پے کمیشن سے کہا تھا — ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۸۲ء) کہ۔

۱۔ ہر ملازم کی تنخواہ اتنی مقرر کی جائے جس میں اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا باطمینان گزارہ ہو سکے۔ اس میں مہنگائی اور ملازم کی ضروریات کی نسبت سے اضافہ ہوتا رہے۔

۲۔ اس ملازم کو اس کی ضمانت اور اطمینان ہو کہ اسے اس رزق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ اس کی ریٹائرمنٹ پر بھی اسے حسب ضرورت پنشن ملتی رہے۔ اور اس کی وفات کی صورت میں، وہی پنشن اس کے بیوی بچوں کو ملتی جائے تاوقتیکہ وہ خود کمائی کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ پنشن کے ساتھ مکان کی سہولت بھی برقرار رکھی جائے۔

یہ کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ جس رشوت اور بدعنوانی کا ہم مستقلاً رونا روتے رہتے ہیں، ان میں کس قدر کمی واقعہ ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو ہوس زر کے مرض میں مبتلا ہوں، یہ ملازمین ناجائز طریقے اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ (۱) جو کچھ انہیں ملتا ہے اس میں ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔ اور (۲) انہیں اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا۔ اگر انہیں اور ان کے بچوں کو تا زیست سامانِ زندگی میسر آنے کی ضمانت دے دی جائے، اور اس کے بعد بھی وہ ناجائز ذرائع اختیار کریں۔ تو پھر انہیں بے شک حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔

ہم نے ان گزارشات کو ملازمین حکومت تک محدود رکھا ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں ان کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر ہوگا۔ یعنی جملہ افرادِ مملکت کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا، مملکت کا فریضہ ہوگا۔ جب یہ افراد، فکرِ معاش سے فارغ اور مطمئن ہو جائیں گے تو پھر ان کی تمام صلاحیتیں ان امور کے سرانجام دینے میں صرف ہوں گی جو ان کے سپرد کئے جائیں گے۔ اس معاشرہ میں طبقاتی تفریق باقی نہیں رہے گی اس لئے باہمی حسد، رقابت، منافست، تکاثر کے زہر آلود جذبات ختم ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہوگا اس لئے کسی کی عزتِ نفس داغدار نہیں ہوگی۔ اس میں کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) نہیں ہوگی اس لئے نظامِ سرمایہ داری کے شجرِ خبیثہ کی جڑ کٹ جائے گی۔ ربوٰا کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ پرائیویٹ پراپرٹی (یعنی جس جائداد سے آمدنی ہوتی ہو) کسی کے پاس نہیں ہوگی اس لئے اس سے پیدا ہونے والے جھگڑے باقی نہیں رہیں گے۔ ذرائع آمدنی اور پیداوار، اسلامی نظام کی تحویل میں رہیں گے جنہیں وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق منفعتِ عامہ کے لئے صرف میں لائے گا۔

یہ ہوگا اسلامی نظام کا معاشی گوشہ۔ لیکن یہ نظام اسی صورت میں قائم ہو سکے گا جب قوم میں قرآنی اقدار کے مطابق نفسیاتی تغیر پیدا ہوگا اور یہ تغیر صحیح تعلیم کی رو سے پیدا ہو سکے گا۔

مرتبہ: محمد اسلام، نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام، کراچی

نگۂ بازگشت

(رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل)

(قسط سوئم)

اس "سفرنامہ" کی پہلی دو قسطیں طلوعِ اسلام بابت جولائی، اگست ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ زیرِ نظر مرحلہ کے کوائف کا بیشتر تعلق اس تبصرہ سے ہے جو ۱۹۷۲ء کے عبوری دستور پر شائع ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں طلوعِ اسلام میں ایک نہایت اہم مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "قرآنی آئین کے بنیادی اصول"۔ وہ مقالہ بھی حالیہ اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے، اس اعتبار سے طلوعِ اسلام کا یہ شمارہ گویا "دستور نمبر" کا سا ہو گیا۔

عبوری آئین

طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۲ء میں عبوری آئینِ پاکستان پر تبصرہ و تنقید کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

اس بدنصیب ملک کی آئینی داستان اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ —— تراشیدم —— پرستیدم —— شکستم۔

نو سال کے صبر آزما انتظار کے بعد ۱۹۵۶ء میں اس کا پہلا آئین مرتب ہوا تو اسے دو سال کے بعد (اکتوبر ۱۹۵۸ء میں) (سابق صدر) ایوب خان نے کالعدم قرار دے دیا۔ چار سال کے بعد (۱۹۶۲ء) میں ایوب خان کا آئین عمل میں آیا تو اسے ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان نے منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد، اب مسٹر بھٹو نے اپنا عبوری آئین مرتب کیا ہے۔ اسے وسط اپریل میں رسمی طور پر نیشنل اسمبلی کے دو روزہ اجلاس میں پیش کر کے منظور کرا لیا گیا۔ اس کی بنیادوں پر اب مستقل آئین مرتب کیا جائے گا۔

مسٹر بھٹو "اسلامی سوشلزم" کے مدعی ہیں۔ چونکہ ہم ابھی تک اس اصطلاح کا مفہوم نہیں سمجھ سکے، اس لئے ہمارا خیال تھا کہ اس آئین میں اسلام نہیں تو کم از کم سوشلزم تو ضرور ہو گی۔ لیکن اس میں ہمیں نہ اسلام نظر آیا، نہ سوشلزم۔ یہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے آئینوں کا ملغوبہ سا ہے جس کی بنیاد صدارتی نظام اور فیڈرل سسٹم آف گورنمنٹ پر رکھی گئی ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس آئین میں بھی سابقہ آئینوں کی طرح اس بنیاد کو ختم کر دیا گیا ہے جس کی رو سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا۔ مطالبہ اور تشکیلِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا۔ دو قومی نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم، وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم نہیں قرار پا سکتے۔ مسلمان دین کے اشتراک کی بناء پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں اور کوئی غیر مسلم

اس قوم کا رکن قرار نہیں پا سکتا۔ زیرِ نظر آئین میں ــــ بجز اس کے کہ صدر اور نائب صدر کے عہدہ کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی ہے۔ کسی جہت سے بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو مسلمانوں سے الگ قرار نہیں دیا گیا۔ ان دونوں کو وطن کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کے بعد، پاکستان کی الگ مملکت کی وجہ جواز کیا رہ جاتی ہے؟ اگر پاکستان میں بسنے والے مسلمان اور ہندو ایک قوم کے افراد ہیں تو پاکستان کے مسلمان اور بھارت کے ہندو ایک قوم کیوں نہیں تسلیم کئے جا سکتے؟ اور جب یہ ایک قوم تصور کئے جا سکتے ہیں تو پھر پاکستانی مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی (JUSTIFICATION) کیا رہ جاتی ہے؟

پاکستانی مسلمانوں اور غیر مسلموں کو الگ الگ قرار دینا تو درکنار، اس آئین میں بھی انتخاب جدا گانہ نہیں رکھا گیا مخلوط رکھا گیا ہے۔ وہی مخلوط انتخاب جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔

باقی رہا نظریۂ پاکستان، سو اس کا آئین میں کہیں ذکر نہیں۔ سلف وفاداری میں البتہ یہ الفاظ موجود ہیں کہ "میں اسلامک آئیڈیالوجی کے تحفظ کی کوشش کروں گا جو تخلیقِ پاکستان کی بنیاد ہے"

لیکن آئین میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اسلامک آئیڈیالوجی ہے کیا جس کے تحفظ کا حلف لیا گیا ہے۔ پچیس سال سے اس ملک میں یہ مذاق اڑ رہا ہے کہ "اسلامک آئیڈیالوجی" اور "آئیڈیالوجی آف پاکستان" کے الفاظ ورد و وظیفہ کی طرح دُہرائے جا رہے ہیں لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ ان الفاظ کا بالآخر مفہوم کیا ہے[1]۔ اور یہی ان کے نزدیک سب سے زیادہ بچت کی صورت ہے۔ اگر ان الفاظ کا مفہوم متعین کر دیا جائے تو پھر یہ دیکھا اور پرکھا جا سکیگا کہ جس بات کا حلف لیا گیا ہے وہ پوری بھی ہو رہی ہے یا نہیں، اور اگر پوری نہیں ہو رہی تو پھر اس کا مواخذہ کیا جا سکے گا"

ہم صدرِ محترم سے باادب پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیا آپ نے سمجھ سوچ کر اس بات کا حلف لیا ہے کہ آپ اس نظریہ کو پاکستان میں عملاً نافذ کر کے اپنی زندگی بھی اسی قالب میں ڈھالینگے اور معاشرہ کا نظام بھی اس کے مطابق تشکیل کرینگے؟

عدلِ عمرانی

پیپلز پارٹی کا دعویٰ ہے (جو صحیح نہیں) کہ ہم "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے اسے استعمال کیا تھا۔ ہمیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں اس آئین میں بھی ایسا نہ لکھ دیں لیکن غنیمت ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے (سابقہ دساتیر کے اتباع میں) یہی کہا ہے کہ

باقی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایک ایسی جمہوری مملکت ہوگی جو عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگی۔

اس سے آگے کہا گیا ہے کہ "یہ مملکت اسلام کے بیان کردہ، جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں پر، کامل طور پر عمل پیرا ہوگی"

ان اصولوں کی وضاحت کہیں نہیں کی گئی۔

مملکت کا نام

یہ غنیمت ہے کہ مملکت کا نام ــــ اسلامک ری پبلک آف پاکستان ــــ رکھا گیا ہے۔

بعض حضرات ہم سے کہا کرتے ہیں کہ ایک طرف تو تم اٹھتے بیٹھتے یہ کہتے رہتے ہو کہ پاکستان

---

[1] یہ آجتک بھی نہیں بتایا گیا (۱۹۸۳ء)

(بلکہ ساری دنیا) میں اسلام کہیں نہیں اور مسلمان محض نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ اور دوسری طرف تم اس پر اظہارِ اطمینان کرتے ہو کہ مملکت کا نام "اسلامی جمہوریہ" رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ (مثلاً) آپ ہندوؤں کے محلہ میں رہیں۔ سارے کام ہندوؤں جیسے کریں لیکن اپنا نام عبدالرحمٰن رکھیں تو ہندو آپ کو کبھی اپنوں میں سے نہیں سمجھے گا۔ اپنے سے غیر ہی تصور کرے گا۔ گویا محض اس نام سے آپ کا جداگانہ تشخص قائم رہے گا۔ جونہی آپ نے اپنا نام بدل کر رام داس رکھا آپ کا جداگانہ تشخص ختم ہو گیا۔ آپ ہندوؤں میں ضم ہو گئے۔ بعینہٖ یہی کیفیت مملکت کی ہے۔ پاکستان میں صحیح اسلام نہ ہو۔ ہم حقیقی معنوں میں مسلمان بھی نہ ہوں لیکن جب تک ہماری مملکت کا نام "اسلامی" ہوگا اس کا جداگانہ تشخص قائم رہے گا[1]۔ جونہی آپ نے اسے "سیکولر سٹیٹ" کہا، اس کا امتیازی نشان مٹ گیا۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ بھارت نے (نام نہاد) "بنگلہ دیش" کا نام "اسلامی مملکت" نہیں رکھنے دیا اس نے "بنگلہ دیش" کو اپنوں میں سے سمجھنا ہے اور پاکستان کو غیروں میں سے۔ ہم شکر گزار ہیں مسٹر بھٹو کے کہ انہوں نے کم از کم مملکت کے نام کے امتیازی نشان کو برقرار رکھا۔

اسلامی قوانین

یہ دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا کہ قانون سازی کے سلسلہ میں، دین کے ساتھ جو مذاق پچیس سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ زیرِ نظر آئین میں بھی اسے علیٰ حالہٖ برقرار رکھا گیا ہے قریب بیس سال اُدھر کی بات ہے جب مجلسِ آئین ساز میں پہلے پہل یہ تجویز پیش ہوئی کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا تو ہم نے کہا تھا کہ یہ تجویز ناممکن العمل ہے۔ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ضابطۂ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکتا، جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس پر مذہبی پیشوائیت نے شور مچا دیا۔ ہمیں منکرِ حدیث۔ ملحد۔ بے دین۔ کافر اور نامعلوم کیا کیا کچھ کہا گیا لیکن ہم اپنی پکار کو برابر دہراتے گئے۔ ادھر اربابِ حکومت بھی چونکہ اس باب میں سنجیدہ (SERIOUS) نہیں تھے کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہوں اس لئے انہوں نے اس تجویز کو اپنے حسبِ منشاء سمجھا اور اسے آئینِ پاکستان میں داخل کر لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ شق داخلِ آئین تو رہی لیکن اس پر عمل کسی ایک دن بھی نہ ہو سکا۔

مذہبی فرقے

۱۹۵۶ء کے آئین میں کہا گیا تھا کہ پرسنل لاز (شخصی قوانین) ہر فرقے کے اپنے اپنے ہونگے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں یہ شق موجود نہیں تھی لیکن بعد میں مذہبی پیشوائیت کے اصرار پر، ایک ترمیم کے ذریعے، یہ شق (جسے قرآن بنصِ صریح شرک قرار دیتا ہے) شاملِ آئین کر دی گئی تھی۔ حالیہ آئین میں "مذہبی فرقہ" کی جگہ "مکتبِ فقہ" (SCHOOL OF LAW) کہا گیا ہے اور اس طرح (شاید) اپنے آپ کو فریب دے لیا گیا ہے کہ ہم نے "فرقوں" کو تسلیم نہیں کیا۔

یاد رکھیئے قرآن کریم کی رو سے:-

۱۔ پبلک لاز اور پرسنل لاز میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

۲۔ اُمت میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ اور

۳۔ اسلامی مملکت کے اندر مختلف مکاتبِ فقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو قوانین اس مملکت کی طرف سے نافذ ہوتے

---

[1] اس نام کا اتنا ہی فائدہ ہوگا۔ اس سے یہ مملکت اسلامی نہیں ہو جائے گی۔ (۱۹۸۳ء)

ہیں وہی رائج الوقت فقہ اور شریعت ہوتی ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔

فیڈرل سسٹم اس آئین میں نظامِ مملکت فیڈرل تجویز کیا گیا ہے جس کی رُو سے، صوبوں کی اختیاری لکیریں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جاتی ہیں اور اس کا اگلا قدم (مشرقی پاکستان کی طرح) مطالبۂ کامل خود مختاری کے بعد، علیحدگی کا رجحان ہوتا ہے۔ وحدانی اندازِ حکومت (UNITARY FORM OF GOVT) میں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ممکن ہے، فیڈرل نظام میں صوبجاتی تعصبات اور باہمی مفاد کے تصادمات ہمیں تباہی کی طرف لے جائیں گے۔ ہماری نجات کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم۔ ان سب کے لئے ایک ضابطۂ قوانین۔ اور ان سب کی ایک مشترکہ (وحدانی) حکومت۔

طلوع اسلام نے مملکتِ پاکستان کے آئین کے بنیادی اصولوں کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتے ہوئے فروری ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں لکھا:۔

اقتدارِ اعلیٰ اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا جس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ حکومت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی قانون، حکم یا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

قانون سازی مملکت کے قوانین کی اساس قرآنِ کریم ہوگی اور مجلسِ قوانین سازیہ، اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قانون مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

فیصلہ کن ادارہ اس آئین کے تابع ایک لاء کمیشن مقرر کیا جائے جو ملک کے مروجہ قوانین کا قرآنِ مجید کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ نیز جو قانون آئندہ بھی زیرِ تدوین آئے وہ اس کے متعلق بھی قرآنی روشنی میں اپنی سفارشات پیش کرے۔

اس سوال کا فیصلہ کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، مملکت کی عدالت عالیہ کرے گی جس میں قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بطور وکیل پیش ہو سکیں گے۔

یاد رکھیئے! جب تک کوئی اتھارٹی مقرر نہیں کی جاتی جو یہ فیصلہ دے سکے کہ حکومت کا فلاں اقدام، احکامِ خداوندی کے مطابق ہے یا نہیں، اور تمام افرادِ قوم کو متنازعہ فیہ معاملات میں اس اتھارٹی کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہو، اس وقت تک آئین میں اس قسم کی شقیں درج کر دینا بے معنی ہے۔ ہماری موجودہ روش، کہ آئین میں اس قسم کی شقیں شامل کر دی جائیں، لیکن عملاً نظامِ حکومت سیکولر ہو، ہمیں تباہ کر کے رکھ دیگی۔ لفظی طور پر اسلام کو "مملکت کا مذہب" قرار دینا۔ مذہبی پیشوائیت کے لئے فساد انگیزی اور ہنگامہ خیزی کے مواقع زیادہ سے زیادہ تر پیدا کرتا جائے گا اور سیکولر نظام کا آخری نتیجہ، سوشلزم یا کمیونزم ہوگا۔

دو قومی نظریہ مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پا سکتے۔ اس لئے انہیں اُمورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وہ اس کی پارلیمان کے ممبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان ممبروں کے انتخاب

میں حصہ لے سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مملکت کی ان آسامیوں پر بھی تعینات نہیں کیے جا سکتے جن کا تعلق رموزِ مملکت سے ہو انہیں صرف وہ مراعات حاصل ہوں گی جن کی تشریح شق ۱۳ میں کی گئی ہے۔

فرقے اور پارٹیاں

قرآن کریم کی اساس پر مملکت کے لئے جو قانون مرتب کیا جائے گا اس کا اطلاق ملک کے تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔

سیاسی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔

بین الملی تعلقات

دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد قرآن کا یہی اساسی اصول ہوگا۔[1]

نظامِ حکومت

نظامِ حکومت وحدانی ہوگا۔

پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک ایوانِ عام ابنائے ملت پر مشتمل اور دوسرا خاص صلاحیتوں کے اہل اعیانِ امت پر۔

پارلیمان کے ایوانوں میں پارٹیوں کا وجود قانوناً ممنوع ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اور حزبِ موافق اور حزبِ مخالف کا غیر اسلامی تصور کارفرما نہیں ہوگا۔

معیارِ اہلیت

صدرِ مملکت، اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ)، ارکان مجالس مقننہ (پارلیمان)، اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت اور ان دیگر افراد پر جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں حسبِ ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

۱۔ قرآن کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

۲۔ متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی کما حقہٗ اہلیت۔

۳۔ صالحیت یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

۴۔ ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اس کا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا، اسی طریق سے اسے معطل یا برطرف کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم

قوم کے بچوں کی (اوّل سے آخر تک) تعلیم کی ذمہ داری، انفرادی طور پر والدین کی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہوگی۔ نظامِ تعلیم میں مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائے گا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

نظامِ عدل

معاشرتی اور قانونی عدل، مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے اور

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ تعلقات بہ تقاضائے حالات، دو طرفہ طور پر ہی استوار کئے جا سکتے ہیں (۱۹۸۳ء)

ان کے عدم حصول کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے گا۔

قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ معاملہ کا فیصلہ قانون کی رو سے ہوگا اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

تقسیماتی تبدیلی مملکت میں کوئی فرد نہ کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔ اس میں محکومیت صرف قانون کی ہوگی جس سے کوئی شخص بھی بالا نہیں ہوگا۔ مملکت، عدل و احسان کی عام کارفرمائی سے ملک میں ایسی فضا پیدا کرے گی جس سے قانون کا احترام افرادِ مملکت کے دل کی گہرائیوں کا تقاضا بن جائے اور اس طرح ہر شخص بلا خوف و حزن زندگی بسر کرے۔

معاشی نظام ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق، وہ کام کرے جسے اس کی اہلیت و صلاحیت کے پیشِ نظر اس کے سپرد کیا گیا ہو، اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے وسائلِ پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے۔ یہ انفرادی ملکیت میں نہیں رہ سکیں گی۔

غیر مسلموں کے حقوق مملکت میں بسنے والے غیر مسلم۔ امورِ مملکت میں شریک نہیں کیے جا سکیں گے کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے ان کی جان، مال، آبرو۔ پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرنے میں، ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اس کے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کی طرف مستقل طور پر منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنے ہاں بسانے پر آمادہ ہو، تو اسلامی مملکت انہیں ان کے امن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام کرے گی۔

لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں گے تو انہیں اس بغاوت کی وہی سزا دی جائے گی جو مسلمان باغیوں کے لئے ہوگی۔

قرآن سوشلسٹوں کے نرغے میں

سابق حکومت پنجاب کے وزیر مالیات محترم محمد حنیف رامے نے ۱۹۷۳-۷۴ء کا صوبائی بجٹ پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہوئے طلوع اسلام نے اپنی اگست ۷۳ء کی اشاعت میں لکھا:۔

سب سے پہلے ہم محترم حنیف صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے بالآخر جرأت سے کام لیتے ہوئے "اسلامی سوشلزم" کے اس حریری نقاب کو اتار پھینکا جو غالباً انہی کا وضع کردہ تھا اور جسے اس سے پہلے اس شد و مد سے پیش کیا جاتا تھا۔ اب کے انہوں نے کھلے کھلے الفاظ میں فرما دیا ہے کہ ان کی منزل سوشلزم ہے۔ یہ غالباً اس لئے کہ ان حضرات نے جب بھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال فرمائی۔ ہم نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ ازراہِ کرم اتنا فرما دیں کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ چونکہ اس سوال کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا اس لئے انہیں اس پر محجوب سا ہونا پڑتا تھا۔ انہوں نے اچھا کیا کہ اس عرق آور نقاب کو اتار پھینکا۔ "بھٹ پڑے وہ سونا جو کانوں کو کھائے"

دوسری بات جو صاف ہو کر سامنے آگئی وہ اس سے بھی اہم ہے۔ ان حضرات سے جب بھی سوشلزم کے متعلق بات ہوئی، انہوں نے جواب دیا کہ اس سے ان کی مراد سوشلسٹ نظامِ معیشت ہے۔ سوشلزم کا نظریۂ زندگی نہیں جو اسلام کے نظریہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر تقریر میں بھی محترم حنیف صاحب نے پہلے یہی فرمایا کہ یہ وہی نظامِ معیشت ہے جو اسلام کے اولین دور میں جلوہ گر ہوا۔

لیکن دو ہی فقرے آگے چل کر ان کے تحت الشعور میں مضمر حقیقت ابھر کر سامنے آگئی جب انہوں نے کہا کہ،

"حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ کو قبول کر کے ہم اسلام سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ اس کی اصلی پاکیزگی کی جانب لوٹ آتے ہیں"

یہی بات ہم شروع سے کہتے چلے آرہے تھے کہ سوشلزم ایک نظامِ معیشت نہیں۔ یہ ایک نظریۂ زندگی ہے جس پر مارکسی نظامِ معیشت کی عمارت استوار ہے اور یہ نظریہ اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوشلزم کا نظریہ کیا ہے اس کی تفصیل ہم اس سے پہلے انہی صفحات پر متعدد بار پیش کر چکے ہیں۔ جس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بطور تجدید یادداشت، صرف لینن کے اس خطاب کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اس نے یونین کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے کہا تھا:

"ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی فوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصور جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے (ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاقِ انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے اس سے ماوراء جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں۔ ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔

(MARX – ENGELS MARXISM, P. P. 461-465)

یہ ہے وہ نظریہ زندگی جس کے متعلق حنیف صاحب فرماتے ہیں کہ،

"اسے قبول کرنے کے بعد ہم اسلام سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ اس کی اصلی پاکیزگی کی طرف لوٹتے ہیں"!

حنیف صاحب اس نظریۂ اخلاق کے آج کے نہیں، مدت کے قائل ہیں۔ ہمیں کسی کے عقائد پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس نظریہ اخلاق کو جی چاہے اختیار کرے لیکن جب کوئی شخص کسی ایسے نظریہ کے متعلق جو کھلے ہوئے کفر اور الحاد پر مبنی ہو، یہ کہے کہ وہ عین اسلام ہی نہیں بلکہ اسلام کی اصلی پاکیزگی کا مظہر ہے تو اس پر خاموش رہنا بارگاہِ خداوندی میں جرمِ عظیم ہے۔ اسلام کے اس قسم کے مدعیوں سے تو وہ کمیونسٹ ہزار درجہ اچھے ہیں جو سوشلزم کے نظریۂ حیات کو کبھی اسلام کہہ کر نہیں پکارتے بلکہ کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں کہ ہم مذہب کے دشمن ہیں خواہ وہ اسلام ہو یا کوئی اور مذہب۔

اشارات سے آگے بڑھ کر، اب آیئے اس مقام کی طرف جہاں حنیف صاحب نے متعین طور پر قرآن پر ہاتھ ڈالا ہے ایک پرانا لطیفہ ہے کہ کسی نے ایک تارک صلوٰۃ (بے نماز) سے کہا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے اس نے جواب دیا کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "لاتقربوا الصلوٰۃ (تم نماز کے قریب مت جاؤ) تو میں نماز کیسے پڑھ سکتا ہوں۔ یہی کچھ حنیف صاحب نے قرآنی آیات کے ساتھ کیا ہے۔ سو ظلم کا معاشی نظام یہ ہے کہ سامانِ معیشت میں سے جو کچھ لوگوں کے پاس ہے۔ اسے ان سے چھین کر حکومت اپنے قبضہ میں لے لے۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے بڑھ کر ظلم اور استبداد پر مبنی نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا کہ حکومت جو کچھ چاہے لوگوں سے چھین کر لے جائے اور اس طرح لوگوں کے پاس کچھ نہ رہے سب کچھ حکومت کی ملکیت قرار پا جائے۔ دنیا میں فرعونی حکومت کو ظلم و استبداد پر مبنی نظام کے لئے بطور ضرب المثل پیش کیا جاتا ہے اور خود قرآن کریم نے بھی اسے اسی مقصد کے لئے بطور مثال پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فرعون کے ظلم و استبداد کا یہ عالم تھا کہ وہ گرجتے برستے، ملک کے باشندوں سے کہتا تھا کہ، اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَ ھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ (۴۳/۵۱) کیا یہ ملک میری ملکیت نہیں اور اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں نہیں؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ لوگوں کی مرضی سے نہیں لیا تھا ان سے زبردستی چھینا تھا جبھی تو وہ اس قدر ظالم، غاصب اور مستبد قرار پایا۔ اور اس کے دماغ کے اس خناس کو نکالنے اور باطل پر مبنی نظام کو الٹنے کے لئے صاحب ضربِ کلیمؑ کو وہاں بھیجنا پڑا۔ لیکن حنیف صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نظامِ معیشت جس میں لوگوں سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے خود قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے۔

چار قومیتیں اور علاقائی کلچر

ساری دنیا کے مسلمان دین کے اشتراک کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مئی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں طلوع اسلام نے لکھا:۔

اب جبکہ ۱۹۷۱ء کے حادثۂ کبریٰ کے عواقب سے متعلق معاملات، خواہی نخواہی یکسو ہو گئے ہیں تو ان کے متعلق مزید گفتگو بے کار ہے۔ یہ کچھ کیوں ہوا۔ کیسے ہوا۔ کون کون اس کا ذمہ دار ہے اور کس حد تک، اب یہ تمام امور آنیوالے مؤرخ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں ہمیں اپنی توجہات اس سوال پر مرکوز کر دینی چاہئیں کہ اس باقی ماندہ پاکستان کے تحفظ بقا، استحکام اور فروغ کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اب بقیہ حصۂ مملکت کے اندرونی احوال و کوائف بھی اس مسئلہ سے کم پریشان کن نہیں جس نے دو سال تک ہمیں وقفِ اضطراب رکھا۔ اس سے کم تو ایک طرف، یہاں کے حالات اس سے بھی زیادہ مخدوش ہیں اور ہمیں خطرہ ہے کہ اگر انہیں فوراً سنبھالا نہ گیا تو اس کے نتائج بھی کچھ کم تباہ کن نہیں ہونگے۔ اس سلسلہ میں ہم شروع ہی میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ نہ تو وہ حالات ہی نئے ہیں جن کا ہم تذکرہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی وہ تدابیر جنہیں ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، انہیں ہم بارہا پیش کر چکے ہیں بہ ایں ہمہ، ان کا دُہرانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح دوائی کو وقفوں کے ساتھ (REPEAT) کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں آکر ہم ابھی تک ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران۔ اسلام کے اس بنیادی اصول کو اُجاگر کیا تھا کہ کسی ملک یا مملکت میں بسنے والے تمام

لوگ وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم نہیں قرار پا سکتے۔ اس میں بسنے والے مسلمان، بلکہ منتہا کے طور پر، ساری دنیا کے مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر، ایک الگ قوم ہوتے ہیں اور غیر مسلم جداگانہ قوم۔ اسے "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیادوں پر ہم نے مملکت پاکستان حاصل کی۔ لیکن یہاں آنے کے بعد ہم نے اپنے اس بنیادی دعویٰ کو خیرباد کہہ دیا اور اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو، ایک قوم تسلیم کر لیا۔ چلئے یونہی سہی۔ اسلام نہیں تو کفر ہی سہی۔ لیکن ستم ظریفی یہ کہ ہم نے کفر کا راستہ بھی "کافرانہ" انداز سے اختیار نہ کیا۔ منافقانہ انداز سے اختیار کیا۔ ہم نے عملاً۔ حتیٰ کہ آئین کی رو سے بھی۔ یہاں کے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کیا لیکن زبان سے "دو قومی نظریہ" کے الفاظ دہراتے رہے۔ اور دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ اس دو رخی پالیسی کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ہماری قومیت کی اساس کیا ہے؟ اگر یہ اساس دو قومی نظریہ ہے تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک قوم قرار دینے کا کیا مطلب ہے اور ہماری قومیت کی اساس "وطن کا اشتراک ہے تو پھر "دو قومی نظریہ" کے الفاظ کی تکرار و اصرار کے کیا معنی ہیں؟ اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی قومیت کی اساس یا وجۂ جامعیت ہی یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو وہ ایک قوم بن ہی نہیں سکتی، افراد کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یاد رکھیئے! جب تک ہم اس دو رخی پالیسی کو نہیں چھوڑتے، ہم قوم بن نہیں سکتے۔

ہم نے عملاً اشتراکِ وطن کو بنائے قومیت قرار دے کر پاکستان کے تمام (مسلم اور غیر مسلم) باشندوں کو ایک قوم تسلیم کر رکھا ہے۔ لیکن اس باب میں بھی ہم دیانت دار نہیں۔ دنیا کی کسی قوم میں آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ اشتراکِ وطن کی بنیادوں پر ایک قوم بنے اور پھر ایسے رجحانات کی پرورش اور ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کرے جو علاقائی تعصب اور قومی تفریق کا موجب بنیں لیکن ہمارے ہاں یہ سلسلہ عرصے سے جاری ہے اور روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ میں جو کچھ "علاقائی کلچر" کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، وہ ملک کے مختلف حصوں کے، ایک دوسرے سے علیحدہ اور منفرد ہونے کا عملی مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمارے ہاں کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں جو لوگ "چار قومیتوں" کا نام لیں انہیں تو پاکستان کا دشمن قرار دیا جائے اور جو لوگ چار قومیتوں کے وجود، نمود اور فروغ کے لئے عملی اقدامات کریں۔ وہ اپنی بیش بہا خدمات کے صلہ میں مستحقِ حمد و ستائش اور سزاوارِ انعام و اکرام ٹھہریں۔ یا للعجب!

یاد رکھیئے! یہاں علاقائی کلچروں کی آڑ میں جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ پاکستان کے خلاف بہت بڑی سازش ہے جس سے مقصد اس ملک کے ٹکڑے کر دینا ہیں۔ مسلم قومیت کا مدار، وحدتِ ایمان پر ہے، جس کا مشہود مظہر وحدتِ امت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

یاد رکھیئے! اگر علاقائی کلچروں کا زہر اسی طرح پھیلایا جاتا رہا۔ تو ہم، اسلام کی بنیادوں پر تو ایک طرف وطن کی بنیادوں پر بھی ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔

پاکستان کی حدود کا تعین

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۳ء کے ایک خطاب میں پرویز صاحب نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا:

باؤنڈری کمیشن نے پاکستان کی حدود کے تعین میں ہمارے ساتھ بدیہی زیادتی کی۔ اس وقت کے حالات کے

تحت ہمیں مجبوراً اس ناقص ملک کو قبول کرنا پڑا لیکن ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور اس کی موجودہ سرحدوں کی حفاظت ہی اپنا نصب العین قرار دے لیا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم ان سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ، اس رقبہ زمین کے حصول کو اپنا قومی فریضہ قرار دیتے جس سے ہمیں محروم کر دیا گیا تھا۔

دوسری غلطی ہم نے یہ کی کہ ہم نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہم نے جب تحریکِ پاکستان کے دوران یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بناء پر ایک قوم ہیں، تو ہمیں چاہیئے تھا کہ حصولِ پاکستان کے بعد، تبادلۂ آبادی کا مطالبہ کرتے، اور "فی کس رقبہ" کے حساب سے ان مسلمانوں کے یہاں بسنے کے لئے، ہندوؤں سے مزید علاقہ حاصل کرتے۔ اس کے لئے بھی ہمیں جدوجہد جاری کرنی اور رکھنی چاہیئے تھی۔

ضرورت ہے کہ ہم،

۱۔ اس مطالبہ کو تازہ کریں کہ اصولِ تقسیم کی رُو سے جس قدر علاقہ پاکستان کے حصہ میں آنا تھا اور جس سے ہمیں باؤنڈری کمیشن نے محروم کر دیا تھا، وہ ہمیں ملنا چاہیئے اور

۲۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں سے (جن میں مقبوضہ کشمیر کے مسلمان بھی شامل ہیں) جس قدر نفوس ادھر منتقل ہونا چاہیں ان کے لئے متناسب رقبہ ہندوستان سے حاصل کر کے انہیں ادھر منتقل کر لیا جائے اس سے ایک طرف ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کو بھی کھلی کا سانس لینا نصیب ہو گا اور دو قومی نظریہ بھی اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچ جائے گا۔

مذہبی امور کے لئے جداگانہ وزارت

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ایک قرارداد متفقہ طور پر پاس ہوئی جس میں حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ اسلامی مملکت میں وزارتِ مذہبی امور کا وجود غیر اسلامی ہے:۔

"حال ہی میں مرکزی حکومتِ پاکستان نے وزارت امورِ مذہبیہ (MINISTRY FOR RELIGIOUS AFFAIRS) کی تخلیق و تشکیل کی ہے۔ مملکت میں مذہبی امور کے لئے جداگانہ وزارت یا شعبہ کی تشکیل سیکولر نظامِ مملکت کا پیدا کردہ تصور ہے جس میں دنیاوی اور مذہبی امور میں ثنویت (DUALISM) ہوتی ہے۔ اسلام اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اسلامی مملکت میں مذہبی امور کے لئے جداگانہ وزارت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلامی مملکت کا ہر شعبہ اور ہر وزارت اسلامی (لہٰذا عرفِ عام میں مذہبی) ہوتی ہے، بالفاظ دیگر ساری کی ساری مملکت دینی ہوتی ہے۔ خود مروجہ آئینِ پاکستان میں کہا گیا ہے کہ "مملکت کا مذہب اسلام ہو گا" جب پوری کی پوری مملکت کا مذہب اسلام ہے تو اس میں امورِ مذہبی کے لئے جداگانہ وزارت کا قیام مملکت کے اس بنیادی دعویٰ کے خلاف ہے۔

طلوعِ اسلام" کنونشن کا یہ اجلاس مرکزی حکومتِ پاکستان سے مستدعی ہے کہ وہ اپنے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کر کے اس وزارت کا قیام ختم کر دے اور پوری کی پوری مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے عملی

اقدامات کرے، جس کا طریق یہ ہے کہ وہ جملہ امورِ مملکت کا فیصلہ قرآن مجید کی روشنی میں کرتی چلی جائے۔ اس مملکت کی ہر وزارت دنیاوی بھی ہوگی اور مذہبی بھی۔

حکومت کا مستحسن اقدام

طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے ایک اجلاس میں حکومت پاکستان کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے کہ اس نے مذہبی امور کے فیصلوں کو اپنے دائرۂ اختیار میں لا کر قرآنِ کریم کی جانب قدم اٹھایا ہے مندرجہ ذیل قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی:۔

حکومت پاکستان نے مرزا غلام احمد قادیانی کی امت کو غیر مسلم قرار دے کر ایک ایسی حقیقت کا اعتراف اور اعلان کیا ہے جسے اسّی، نوّے سال تک مقدس فریب کے نقابوں میں چھپایا گیا۔ حکومت کا یہ اقدام ہی کچھ کم مستحقِ تہنیت نہیں، لیکن جس انداز سے یہ قدم اٹھایا گیا ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ درخورِ تحسین و آفرین ہے۔ حکومت نے قانون کی رُو سے اس کا فیصلہ کرکے اس حقیقت کا گویا اعلان کر دیا ہے کہ اسلامی مملکت میں وہ تمام امور جنہیں غلط فہمی یا غلط اندیشی کی بنا پر مذہبی کہا جاتا ہے' مذہبی پیشوائیت کے دائرہ اختیار میں نہیں رہتے بلکہ مملکت کے فرائض میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کا فیصلہ علماء کے فتووں سے نہیں بلکہ حکومت کے قانون کی رو سے ہوتا ہے۔

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس مرکزی حکومت پاکستان کو اس کے اس فیصلے پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوا حکومت سے مستدعی ہے کہ وہ اسی طریق سے پاکستان کے جملہ مسائل (مذہبی اور دنیاوی کی تفریق کے بغیر) قرآن کریم کی روشنی میں حل کرتے جائیں۔ اس طرح یہ مملکت رفتہ رفتہ کاملۃً اسلامی بن جائے گی اور وہ مقصدِ عظیم پورا ہو جائے گا جس کیلئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ارباب اقتدار اور مذہبی راہنماؤں کے اندازِ فکر کا تجزیہ ان کے احکامات اور بیانات کی روشنی میں کرتے ہوئے طلوع اسلام نے دسمبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں لکھا۔

ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ:

اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ یہاں اسلامی نظام قائم اور اسلامی معاشرہ متشکل ہوگا اس دعویٰ کے پیشِ نظر اس مملکت کا نام "اسلامی جمہوریہ" رکھا گیا۔ دستور میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا، یہ بھی کہ یہاں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ وضع کیا جائے گا نہ رائج۔ لیکن اس کے باوجود یہاں۔ نہ اربابِ اقتدار کا ذہن اس باب میں صاف ہے کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں اور اسلامی نظام کہتے کسے ہیں اور نہ ہی مذہبی رہنماؤں کا اندازِ نگاہ اسلامی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں یہ سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں کہ اسلامی نظام ہوتا کیا ہے۔

ان دونوں کی نگاہ غیر اسلامی ہے اور اندازِ فکر سیکولر۔ ہمارے اس دعویٰ پر بہت سے ذہنوں میں اختلاف کی لہریں ابھریں گی۔ بالخصوص مذہب پرست طبقہ کے ذہن میں۔ ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں اور پھر ان اختلافی احساس رکھنے والے حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے یا تعصب پر؟

"احمدیوں کے متعلق حالیہ فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے محترم وزیر اعظم نے فرمایا تھا کہ ہم نے یہ مطالبہ عوام (یعنی ملک کی اکثریت) کی خواہش کے مطابق کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ یہ اسلام کا مطالبہ تھا۔ کہا یہ کہ یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ ملک کی اکثریت ایسا چاہتی تھی (انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ فیصلہ مذہبی بھی ہے اور سیکولر بھی۔ یعنی یہ فیصلہ "اسلامی سوشلزم" کی طرح مذہبی سیکولرازم پر مبنی ہے) اس سے واضح ہے کہ اگر یہاں کی آبادی کی اکثریت "احمدی" افراد پر مشتمل ہوتی تو فیصلہ ان کے حق میں کیا جاتا۔ بالفاظ دیگر یہاں فیصلوں کا مدار و معیار اکثریت کی خواہشات اور آراء ہیں۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ملک کے ارباب دانش و بینش سے کہ اسے "سیکولر جمہوریت" نہیں کہتے تو اور کیا کہتے ہیں۔

اب آیئے ارباب مذہب کی طرف۔ انہوں نے شروع سے مملکت کے قوانین کو پرسنل (شخصی) لاز اور پبلک (ملکی) لاز میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پرسنل لاز ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں گے اور پبلک لاز مملکت کے وضع کردہ۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ارباب فکر و دانش سے کہ کیا یہ تقسیم سیکولر نظام سیاست کی وضع کردہ اور سیکولر حکومتوں میں رائج ہے یا نہیں؟ اور ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں ارباب مذہب سے کہ کیا عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں (جب اسلامی نظام قائم تھا) پرسنل لاز اور پبلک لاز میں یہ تفریق و تمیز موجود تھی؟ کیا یہ مسلمانوں کے دور ملوکیت میں وضع نہیں ہوئی جب نظام حکومت سیکولر تھا۔ یعنی جب مذہبی امور اور دنیاوی امور میں ثنویت کا نظریہ رائج اور نافذ کیا گیا تھا۔

ہم اس مقام پر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان حضرات کے تصور کی رو سے اسلام میں صحیح اور غلط، اسلامی اور غیر اسلامی کے لئے کوئی مستقل، غیر متبدل معیار نہیں۔ معیار "اکثریت" ہے۔ جو کچھ اکثریت کے نظریہ اور مسلک کے مطابق ہو وہ قابل قبول (اور صحیح) اور اقلیت کا نظریہ اور مسلک غلط اور ناقابل قبول کیونکہ ان کی تعداد کم ہے۔

بقیہ حقائق و عبر (صفحہ ۶۲)

اپنے آپ کو قادیانی لکھ کر استثنیٰ حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ غیر مسلم ہوتے تو انہیں استثنیٰ حاصل کرنیکی ضرورت ہی پیش نہ آتی کیونکہ "غیر مسلم عناصر ہیں ہی الگ"!

"ختم نبوت" کو جزو ایمان ماننے والوں کے لئے یہ امر گہرے غور و تدبر کا متقاضی ہے کہ یہ حضرات چپکے ہی چپکے کس سازش کے در پے ہیں؟ اگر کسی ایک احمدی (قادیانی یا لاہوری) نے زکوٰۃ آرڈیننس سے استثنیٰ حاصل کر لی تو ان کا یہ دعویٰ مسلّم ہو جائیگا کہ حکومت انہیں مسلمان تسلیم کرتی ہے۔ ہم زکوٰۃ سے متعلق ارباب حکومت سے بھی گزارش کرینگے کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں واضح کریں کہ کیا "احمدی" زکوٰۃ آرڈیننس سے استثنیٰ حاصل کرنے کی درخواست دے رہے ہیں اگر ایسا ہے تو حکومت کی طرف سے انہیں کیا جواب دیا جاتا ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

قرآنی آئین کے بنیادی اصول

شائع کردہ: فروری ۱۹۷۱ء
بار دیگر: اگست ۱۹۸۳ء

باسمہٖ تعالیٰ

قرآنی آئینِ مملکت کے بنیادی اصول

(نوشتہ فروری ۱۹۷۱ء)

گزشتہ کچھ دنوں سے مملکتِ پاکستان کے لئے آئین کے سلسلہ میں کافی چرچا ہو رہا ہے اور اطراف و جوانب اس باب میں طرح طرح کی تجاویز بھی پیش ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم نے اس موضوع پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اس لئے کہ جب تک کوئی متعین بات سامنے نہ آئے اس کے متعلق لکھا کیا جا سکتا ہے! لیکن قارئین طلوعِ اسلام کی طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ کم از کم اتنا تو بتا دیا جائے کہ قرآن کریم اس ضمن میں راہنمائی کیا دیتا ہے۔ اس راہنمائی کے متعلق ہم نے سابقہ ایام میں بڑی کثرت سے لکھا تھا۔ اور فروری ۱۹۷۱ء میں جو مقالہ (اور پمفلٹ) شائع کیا تھا وہ بڑا جامع تھا۔ اس پمفلٹ کو اب نظرِ ثانی اور مختصر اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جاتا ہے ـــ پہلے (شروع اگست میں) پمفلٹ کی شکل میں، اور پھر ستمبر کے طلوعِ اسلام میں مقالہ کی صورت میں۔ اس سلسلہ میں دو تین بنیادی امور کو پیشِ نظر رکھئے۔

(۱) قرآن کریم اسلامی مملکت کے دستور کی جزئیات بھی خود متعین نہیں کرتا۔ وہ صرف اصول دیتا ہے اور اس امت کی مشاورت پر چھوڑتا ہے کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔ قرآن کے اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی جزئیات قابلِ تغیر و تبدل ہوں گی۔ اس لئے کسی دور کے لئے کسی سابقہ دور کی جزئیات کی پابندی لازمی نہیں ہو گی۔

(۲) قرآنی اصولوں پر اسلامی مملکت ہی میں عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ اگر مملکت (قرآنی معیار کے مطابق) اسلامی نہ ہو، تو اس میں قرآنی اصولوں کی کارفرمائی کا سوال پیدا نہیں ہو گا۔ سطحی ذہنیت رکھنے والے عام طور پر کرتے یہ ہیں کہ قرآنی اصولوں کا جائزہ موجودہ حالات کی روشنی میں لیتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ جو اصول اس وقت پیش کئے جا رہے ہیں وہ اسلامی مملکت کے آئین کی بنیادیں قرار پانے کے لئے ہیں۔

(۳) ہم نے یہ اصول قرآنِ کریم سے اپنی بصیرت کے مطابق اخذ کئے ہیں، اور ان سے جو نتائج مستنبط کئے ہیں، وہ بھی ہمارے غور و فکر کا نتیجہ ہیں جو نہ حرفِ آخر قرار پا سکتے ہیں، نہ سہو و خطا سے منزہ۔ ارباب دانش و بینش ان پر خود غور کر کے نتائج مستنبط کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ قرآن کی ہمہ گیر تعلیم و ہدایت کے مطابق ہوں۔

ان تمہیدی اشارات کے بعد، ہمارا ۱۹۷۱ء کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ (اگست ۱۹۸۳ء)

مملکتِ پاکستان کی عمر کل تیئیس سال کی ہے، اور تیئیس ہی سال سے یہ اپنے آئین کی تلاش میں مارے مارے پھر رہی ہے۔ جس طرح اس مملکت کا، بغیر کسی جنگ و جدال کے حصول ایک نادر واقعہ تھا، اسی طرح ایک مملکت کا اپنی ساری عمر بے آئین رہنا بھی عدیم المثال سانحہ ہے۔ نو سال کے صبر آزما انتظار کے بعد ۱۹۵۶ء میں پہلا آئین مرتب اور نافذ ہوا تو دو ہی سال کے بعد، اسے عسکری انقلاب کا سیلاب بہا کر لے گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں دوسرا آئین نافذ ہوا تو اسے ۱۹۶۸ء کا جھکڑ اڑا کر لے گیا۔ اب پھر، از سرِ نو وہی مرحلہ درپیش ہے۔

آئین سازی کا کام تو مجلسِ آئین ساز کا تھا، اور ہے، لیکن طلوعِ اسلام نے اپنے اوپر یہ فریضہ عاید کر رکھا ہے کہ وہ ہر درپیش آمدہ معاملہ کے متعلق بتائے کہ قرآن کریم ہمیں اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے، اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس کیا اور ہر دوراہے پر للکار کر بتایا کہ جانبِ قبلہ کونسی راہ جاتی ہے۔ پہلی مجلسِ دستور ساز نے ۱۹۵۰ء میں قراردادِ مقاصد اور دیگر اصولات کے مسودات مرتب کئے تو طلوعِ اسلام نے (نومبر ۱۹۵۰ء میں) اپنی تنقیدات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ اس نے دو سال کے بعد (نومبر ۵۲ء میں) "قرآنی دستورِ پاکستان" کے نام سے پہلا کتابچہ شائع کیا جو اس وقت تک، آئین سازی کے سلسلہ میں اصولی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ پھر جب، ۱۹۵۷ء میں، لاء کمیشن کا انعقاد عمل میں آیا تو ہم نے "اسلام میں قانون سازی کا اصول" کے عنوان سے (اردو اور انگریزی میں) دو کتابچے شائع کئے جو اس باب میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جب عسکری حکومت نے آئینی کمیشن کی تشکیل کی تو ہم نے دو مبسوط پمفلٹ شائع کئے جن میں سے ایک کا عنوان تھا "اسلامی آئین کے بنیادی اصول" اور دوسرے کا "اسلامی مملکت میں قانونِ شریعت کس طرح مرتب ہوگا؟" علاوہ ازیں، طلوعِ اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں، اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہا۔ اب جبکہ پھر آئین سازی کا مرحلہ درپیش ہے (صدرِ مملکت نے اعلان کیا ہے کہ نو منتخب شدہ مجلسِ آئین ساز کا اجلاس فروری ۱۹۷۱ء میں منعقد ہوگا) تو ہم نے ضروری سمجھا کہ ایک بار پھر واضح کیا جائے کہ اسلامی مملکت کے آئین کے سلسلے میں قرآن کریم کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں دو بنیادی نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

دو بنیادی نکات

۱۔ قرآن کریم انسانی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اصولی راہنمائی دیتا ہے۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کرتا۔ یوں کہیے کہ وہ ایسی حدود مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے امتِ مسلمہ، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی تفصیلات خود مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول یا حدود غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کی بنیادوں پر مرتب کردہ جزئیات میں، عند الضرورت، ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ قرآن کریم کاروانِ ملت کے لئے ایک منتہیٰ مقرر کرتا ہے، اس کے سامنے ایک نصب العین رکھتا ہے جس تک آہستہ آہستہ، بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جو قرآنی نصب العین پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتی اور اس تک پہنچنا اپنا مقصودِ حیات سمجھتی تھی۔ ہماری حالت اس سے مختلف ہے۔ ہم نام تو وہی رکھتے ہیں جو اس امت کا تھا لیکن ہمارا ایمان، ان کا سا ایمان نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو خدا کی کتاب سمجھتے ہوئے بھی ہمارا عمل اس کے مطابق نہیں۔ بنا بریں، ہمارے لئے کشاد کی راہ یہی ہوگی کہ قرآن کے مقرر کردہ منتہیٰ

کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھیں اور پھر یہ طے کریں کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اس سے اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے کونسی تدریجی منازل اپنے لئے مقرر کریں۔ یوں یہ مملکت، رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ بتدریج اسلامی بنتی جائے گی۔ یہ نہیں کہ ادھر اس نے قراردادِ مقاصد پاس کی، اور اُدھر ہم نے ڈھول بجانے شروع کر دیئے کہ مملکت اسلامی ہو گئی ہے۔

ان تمہیدی نکات کے بعد، اب ان اصولوں کی طرف آیئے جنہیں قرآن کریم نے اسلامی مملکت کے آئین کے لئے بطور حدود متعین کیا ہے۔ ہمارا فریضہ ان اصولوں کو سامنے لانا ہے۔ یہ کام مجلس آئین ساز کا ہوگا کہ وہ موجودہ حالات کے مطابق، ان اصولوں کی جزئیات مرتب کرے۔

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY)

اقتدارِ اعلیٰ سے مراد ہوتی ہے مملکت کی وہ اتھارٹی جس کا فیصلہ، آخری ہو، اور جس سے سرکشی، مملکت کے خلاف بغاوت قرار پائے۔ ملوکیت میں یہ اتھارٹی، بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ آمریت میں ڈکٹیٹر اور مغربی انداز جمہوریت میں عوام ــــ قرآن کی رُو سے، یہ اتھارٹی نہ بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے، نہ ڈکٹیٹر کو۔ نہ عوام کو حاصل ہوتی ہے، نہ خواص کو۔ یہ اقتدار صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کا ارشاد ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷) حقِ حکومت، (آخری فیصلہ دینے کا حق) صرف خدا کو حاصل ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۲۳) اس کے کسی فیصلہ کو (QUESTION) نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے فلاں قانون ایسا کیوں بنایا ہے۔ اس کے سوا ہر ایک کی اتھارٹی کو (QUESTION) کیا جا سکتا ہے

لیکن خدا کو نہ کسی کے سامنے آنا ہے اور نہ ہی ہم اس کی بات سن سکتے ہیں، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکے اس حقِ حکومت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا جواب اس نے خود ہی دیدیا کہ خدا کی محکومیت اسکی کتاب کی اطاعت کے ذریعے اختیار کی جائے۔ اسکا ارشاد ہے کہ:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

(اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم بنالوں، درآنحالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجدی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں، انسانوں کو ــــ خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو، یا افراد کی جماعت ــــ یہی کفر اور اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے۔ وہی لوگ کافر ہیں۔

اسی لئے خود حضور نبی اکرمؐ سے جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی تھی، کہا گیا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔

یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جسے قائد اعظمؒ نے ان درخشندہ الفاظ میں پیش کیا تھا جنہیں ہم سو بار دہرا چکے ہیں اور شاید کبھی ہزار بار دہرانا پڑے تاکہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں قائد اعظمؒ کے تصوّر کے مطابق آئین مرتب کرنا چاہیئے انہیں معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قائد اعظمؒ کا تصور اور ایمان کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، اور نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (حیدر آباد۔ دکن۔ اگست ۱۹۴۱ء)

لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین کی شق اوّل یہ ہونی چاہیئے کہ

اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا جس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ حکومت خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کیجائے گی اور اس کے خلاف کوئی قانون، حکم یا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

۲۔ مجلسِ آئین و قوانین ساز کے حدود

قرآن کریم کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..... (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس لئے سربراہِ مملکت ہو یا پارلیمان، قرآنی احکام و اصولات میں، نہ تو کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمان، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکت کے لئے قانون بنا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی "جمہوریت" لامحدود اور غیر مشروط نہیں ہو سکتی۔ یہ (CONTROLLED DEMOCRACY) ہوگی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہوگا۔

لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین کی دوسری شق یہ ہونی چاہیئے کہ،

مملکت کے قوانین کی اساس قرآنِ کریم ہوگی اور مجلسِ قوانین ساز، اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قانون

مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوسکے گا جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔

۳۔ فیصلہ کُن ادارہ

اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون، قرآنِ مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس کی رُو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ سفید ہاتھی "محض نورِ نمائشی ہنڈیاں ہیں جن سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ سات آٹھ سال[1] کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ادارے فی الحقیقت بیکارِ محض ہیں، انہیں ختم کر دینا چاہیئے اور ان کی جگہ ایک لاء کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ ملک کے مروّجہ قوانین کو قرآن کے مطابق بنانے کی سفارشات کرے اور آئندہ بھی جو قانون زیرِ ترتیب آئے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھ کر اپنی سفارش پیش کرے۔ لیکن اس بات کا آخری فیصلہ عدالتِ عالیہ کرے کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ بنا بریں، آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:

> اس آئین کے تابع ایک لاء کمیشن مقرر کیا جائے جو ملک کے مروّجہ قوانین کا قرآنِ مجید کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ نیز جو قانون آئندہ بھی زیرِ تدوین آئے، وہ اس کے متعلق بھی قرآنی روشنی میں اپنی سفارش پیش کرے۔
>
> اس سوال کا فیصلہ کہ فلاں قانون، قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، مملکت کی عدالتِ عالیہ کرے گی جس میں قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، بطورِ وکیل پیش ہوسکیں گے۔

یاد رکھئے۔ امتِ مسلمہ میں مذہبی پیشوائیت کا تصوّر اور وجود غیر قرآنی ہے۔ اسلامی مملکت میں یہ فیصلہ کرنا کہ فلاں معاملہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں، حکومت کے قائم کردہ ادارہ کا کام ہے۔

---

[1] اب بیس اکیس سال کہئے۔ (۱۹۸۲ء)

۴۔ معیارِ قومیت

اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت، شورائیت پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری امت پر، اور اس کا کاروبار، افرادِ امت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہا گیا تھا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸)۔ امورِ مملکت میں تم ان سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن نے صرف یہ اصول دیا ہے۔ باہمی مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا تعیین خود نہیں کیا کیونکہ عملی شکل مختلف زمانوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ ہماری ضروریات کے مطابق، اس کا تعیین ہمیں خود کرنا چاہیئے۔

اس اصول میں، قرآن کریم نے (بَيْنَهُمْ) کی جو شرط عاید کی ہے (یعنی افرادِ امت آپس میں مشورہ کریں) وہ بڑی اہم ہے اور دین میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے یہی "اسلام میں معیارِ قومیت" ہے۔ ہم اس موضوع پر ۱۹۳۸ء سے لکھتے چلے آئے ہیں — اس لئے کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہی اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رو سے "قومیت کا معیار رنگ اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے"، اور طلوعِ اسلام اس دعویٰ کو، قرآن اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بتکرار و اصرار پیش کر رہا تھا۔ اسی معیارِ قومیت کے مطابق پاکستان کا وجود عمل میں آیا اس لئے اسے کسی صورت میں بھی مابہ النزاع نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ امر باعثِ صد تاسف ہے کہ اس چھتیس سال میں، مملکتِ پاکستان کی اس اساسی حقیقت کو قطعیۃً نظر انداز کر دیا گیا اور اب یہ قریب قریب نسیاً منسیا ہو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اسے ایک بار پھر، ذرا تفصیل سے پیش کیا جائے۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) تمام نوعِ انسان شروع شروع میں امتِ واحدہ (ایک برادری) کی طرح تھے۔ پھر انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے۔ یہ اختلافات، رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کے اختلاف پر مبنی تھے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ "اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے"۔ اس سے واضح ہے کہ انسانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا ذریعہ خدا کی کتاب ہوتی تھی، یعنی وحیِ خداوندی۔ جو لوگ اس وحی کو ضابطۂ حیات تسلیم کرتے تھے وہ رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کے اختلافات سے بلند ہو کر، ایک برادری بن جاتے تھے۔ جو اسے تسلیم نہیں کرتے تھے، وہ، رنگ، نسل، خون، زبان یا وطن کے اختلافات کو قائم رکھنے کی وجہ سے، دوسری قوم کے افراد قرار پاتے تھے۔ اس معیار کے مطابق، تمام نوعِ انسان اصولی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲) "اللہ وہ ہے جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ ان کا ہے جنہیں کافر کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ ان کا جو مومن کہلاتے ہیں"۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں "کافر" کا لفظ ایسے گھناؤنے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس نے اسے ان معنوں میں استعمال کیا ہے

جن معنوں میں ہم آج (NON - MEMBERS) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کے وہ تمام انسان جو ان اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو وحی کی رُو سے ملے ہیں (اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں) ایک گروہ، ایک جماعت، ایک قوم، ایک پارٹی کے ممبر ہیں۔ اور جو لوگ ان اقدار پر یقین نہیں رکھتے وہ اس پارٹی کے ممبر نہیں یعنی وہ (NON - MEMBERS) کافر ہیں۔ یہ ہے قرآن کی رُو سے دنیا کے تمام انسانوں میں قومیت کی تقسیم کا معیار۔ اس کے نزدیک، دنیا میں قومیں صرف دو ہیں۔ مومنین کی قوم اور غیر مومنین کی قوم۔ وہ کہتا ہے کہ یہی وہ دو قومیں ہیں جن میں شروع سے باہمی نزاع و پیکار چلی آرہی ہے۔ چنانچہ جب وہ اس ضمن میں سب سے پہلی کشمکش کا ذکر کرتا ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانے

ازل سے تا امروز

میں سامنے آئی تو وہ کہتا ہے کہ اس میں حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف۔ جب حضرت نوحؑ اپنی "قوم" (جماعت مومنین) کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور کہا کہ ہمارے ساتھ آجا۔ وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (۱۱/۴۲)۔ اور تو کافروں کے گروہ کے ساتھ نہ رہ۔ لیکن جب وہ اپنی روشِ زندگی کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوا تو حضرت نوحؑ (کا ہم وطن ہونا تو ایک طرف، ان کا بیٹا ہونا بھی) اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ اپنی پارٹی والوں کے ساتھ ہلاک ہوگیا۔ اور جب حضرت نوحؑ نے خیال کیا کہ وہ انکے اپنے خاندان (اہل) میں سے تھا تو وحیٔ خداوندی نے یہ کہکر اس کی صراحت کر دی کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (۱۱/۴۶) نہیں، وہ بیت اہل میں سے نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپؑ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۹/۴۸)۔ میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو، ان سب سے الگ ہوا ہوں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سے کہدیا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۶۰/۴) ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو۔ ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔ كَفَرْنَا بِكُمْ ہم تم سے برسرِ ستیز کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ بَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا۔ تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کرو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰/۴) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴/۳۶) جو شخص اس راستے میں میرے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے۔ اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی۔ اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (۶۶/۱۰)۔ قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسان کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا۔ تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آگیا جب وحی کی تکمیل ہوگئی اور اس کے مطابق

قومِ رسولِ ہاشمیؐ

نبی کریمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیلِ قومیت کے مطابق

حبش کا بلال، فارس کا سلمان اور روم کا صہیب رضی اللہ عنہم محمد عربی کی اپنی قوم کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور حقیقی چچا ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور ان کا باپ عتبہ دوسری طرف حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اُس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھیئے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مدمقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت جو وطن۔ رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمتِ محمدیہ۔ وہ ملّتِ اسلامیہ، وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار کی قوم) بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔

اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ان سے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳/۱۱۷) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے) ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۲۰) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔[۱]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) نہ تو خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے ہیں فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ مومن نہیں کافر ہے (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸)۔ ان میں کسی غیر کو

---

[۱] عدمِ گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے ۳/۲۷ ؛ ۴/۱۳۹ ؛ ۴/۸۹ ؛ ۴/۱۴۴ ؛ ۵/۵۵ ؛ ۸/۷۳ ؛ ۹/۱۰ ؛ ۵۸/۲۲ ؛ ۶۰/۱-۴۔

شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہؐ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفاء راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم ان کی حکومت خالصتہً جماعتِ مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس میں ایک ایسی "اقلیت" کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔

یہ تھا وہ معیارِ قومیت اور نظامِ حکومت جو قرآن نے مسلمانوں کو دیا تھا۔ اور اسی کے مطابق ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا[1]۔ یہ مطالبہ ہمارے عقیدہ کی بنیاد پر تھا، ہمارے دین کا جزو تھا۔ نہ اس میں کسی سودا بازی کا سوال تھا، نہ مفاہمت (COMPROMISE) کی کوئی گنجائش۔ دنیا اسے ہماری ضد کہتی تھی۔ ہم اسے اپنا ایمان قرار دیتے تھے اور یہی وہ ایمان تھا جس کی قوت سے ہم نے اپنا یہ مطالبہ دنیا سے منوا لیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

آج جب ہمارے "علماء کرام" کسی پر کفر کا فتویٰ لگا کر کہتے ہیں کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا، تو اس کا کوئی عملی مفہوم سامنے نہیں آتا۔ ان فتووں کو کوئی (SERIOUSLY) لیتا ہی نہیں۔ اور جو (SERIOUSLY) لیتے بھی ہیں، وہ بھی اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ قیامت کے دن جہنم رسید کئے جائیں گے۔ لیکن اسلامی مملکت میں اس کا عملی مفہوم ہوتا تھا۔ پہلے تو یہ کہ اس میں کوئی عالم یا مفتی اس کا مجاز نہیں ہوتا تھا کہ کسی کو مومن اور کسی کو کافر قرار دے۔ یہ اختیار صرف اسلامی مملکت کو حاصل ہوتا تھا۔ اور اس کی ایک آئینی حیثیت ہوتی تھی۔ وہ مملکت جسے کافر قرار دے وہ مملکت سے متعلق کسی معاملہ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ وہ آئینی طور پر (DISQUALIFY) اور (DISFRANCHISE) ہو جاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ نہ وہ اسلامی پارلیمان کا ممبر بن سکتا تھا، نہ ان ممبروں کے انتخابات کے لئے ووٹ دے سکتا تھا۔ نہ مملکت سے متعلق امور میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا نہ ہی وہ کسی ایسی اسامی پر متعین ہو سکتا تھا جس میں اس امر کا احتمال ہو کہ اس طرح اس کی رسائی امورِ مملکت تک ہو جائے گی۔ مختصر الفاظ میں، وہ اس مملکت میں بسنے والی مسلم قوم کا فرد شمار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے لوگ (غیر مسلم) اس مملکت کے ایسے باشندے قرار پاتے تھے جن کی جان، مال، عصمت، عزت و آبرو، مذہب اور عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ اسلامی مملکت لیتی تھی۔ اور انہیں وہ تمام مراعات دیتی تھی جو انسان ہونے کی حیثیت سے اور قرآن کی رُو سے ہر بنی آدم کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ شریکِ امورِ مملکت نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ ہے وہ دو قومی نظریہ جو دین کا اساسی رکن ہے اور جس پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین میں اس کی صراحت ہونی چاہیئے کہ

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پا سکتے۔ اس لئے

---

[1] اس اصول کے مطابق دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم نے اس فراموش کردہ حقیقت کی تجدید کے لئے پہلے ایک خطہ کو منتخب کیا تاکہ اس خطہ میں اس حقیقت کو بنیاد بنا کر دنیا کے باقی مسلمانوں کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود یہ تھا اب تم اس کی وسعتوں کو آگے پھیلاتے چلے جاؤ۔ [لیکن یہاں نسلی اور صوبائی تفریق پہلے سے بھی شدید ہو گئی۔ اس قسم کی تفریق خلافِ اسلام ہے۔ ۱۹۸۳ء]

انہیں امورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وہ اس کی پارلیمان کے ممبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان ممبروں کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مملکت کی ان اسامیوں پر بھی تعینات نہیں کئے جا سکتے جن کا تعلق رموزِ مملکت سے ہو۔ انہیں صرف وہ مراعات حاصل ہوں گی جن کی تشریح آئین کی شق ۱۴۳ میں کی گئی ہے۔

اور دیکھئے جس آئین میں یہ شق موجود ہو، نہ وہ آئین اسلامی کہلا سکتا ہے اور نہ ہی وہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے۔ قرآن اس باب میں کسی قسم کی مفاہمت کی اجازت نہیں دیتا، یہ دین کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ وَلَا تُبَدِّلُ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ

۵۔ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹانے کا ذریعہ "کتاب" قرار دیا گیا ہے، تو آپ نے غور فرمایا ہے کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔ ایک ملک میں بسنے والے افراد، ایک قوم اسی صورت میں بنتے ہیں جب وہ ایک ضابطہ قوانین کی اطاعت کریں۔ بالفاظِ دیگر، قوم کی وحدت کا انحصار، قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مختلف گروہ مختلف قوانین کے تابع زندگی بسر کریں، تو ان میں کبھی وحدت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اُمتِ مسلمہ بھی امتِ واحدہ اسی صورت میں بن سکتی ہے جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع رہے۔ اور چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ضابطہ قوانین (قرآن مجید) کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے اس لئے ان میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں نہ تو شخصی (PERSONAL LAWS) اور تمدنی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا کوئی تصور ہے۔ امت میں فرقوں کا وجود، اس کی نصِ صریح کی رُو سے شرک ہے (۳۰/۳۱) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں، اس لئے جسطرح مذہبی فرقوں کا وجود، از روئے قرآن شرک ہے، اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی خلافِ اسلام ہے۔ قرآن نے اسے سیاست، فرعونی سے تعبیر کیا ہے (۲۸/۴)۔ ہمیں تسلیم ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کے شرک کو بایک جنبشِ قلم نہیں مٹایا جا سکتا، لیکن سیاسی پارٹیوں کو تو ختم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، اگر:

۱۔ قرآن کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جائے تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہوگا..... اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

۲۔ تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی ثنویت ختم کر کے سب بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے اُن میں عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی بلند اقدار کا شعور بھی پیدا ہوتا چلا جائے اس طرح اُن کے دل و دماغ سے فرقہ وارانہ امتیازات کی لکیریں خود بخود مٹتی چلی جائیں۔

لہٰذا ہمارے مجوزہ آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:

قرآن کی اساس پر مملکت کے لئے جو قانون مرتب کیا جائے گا اس کا اطلاق ملک کے تمام

مسلمان باشندوں پر یکساں ہوگا۔

۶۔ بین الملّی تعلقات

دین کے اشتراک پر قومیت کی تشکیل کے یہ معنی نہیں کہ کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے الگ ایک جداگانہ قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے (اور قرآن کا درحقیقت منشاء بھی یہی تھا) کہ دین کے رشتہ میں منسلک افراد، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی بستے ہوں، ایک قوم کے افراد قرار پائیں گے۔ امتِ واحدہ دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کی الگ الگ حکومتیں ہو سکتی ہیں لیکن وہ الگ الگ اقوام میں نہیں بٹ سکتے۔ لہٰذا قرآنی نقطۂ نگاہ سے جہاں پوری مملکت کی سالمیت اور وحدت اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اُس کے ساتھ ہی دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں سے اس قسم کے تعلقات جیسے ایک قوم کے افراد میں ہوتے ہیں، دین کی لازمی طرز ہے۔ بنابریں، قرآنی دستور پاکستان کی ایک شق یہ بھی ہونی چاہیئے کہ

> دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد قرآن کا یہی اساسی اصول ہوگا۔

۷۔ نظامِ حکومت

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے، ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن ہم نے پاکستان میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے جس کی وجہ سے، خود پاکستان میں بسنے والے مسلمان بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے پہلے ملک کو دو بازوؤں میں تقسیم کیا اور اب مغربی بازو کو چار ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ یہ تقسیم اگر محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ہم نے ان خطوں میں الگ الگ مفادات کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن سے یہ قوم، مختلف اقوام میں تقسیم ہوگئی، اور وہ بھی ایسی اقوام جن میں باہمی رقابت عصبیت اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جائیں۔ ہم نے ان خطوں میں بسنے والوں کے لئے ملازمتوں میں جداگانہ تناسب مقرر کیا اور پارلیمان میں نشستوں کی تقسیم بھی اسی نسبت سے کر دی۔ یہ تقسیم باہمی مفادات میں ایسے مستقل تصادم کا موجب بن گئی جس سے نہ صرف ناخن، گوشت سے الگ ہو گیا بلکہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا۔ جب غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے آبادی کے تناسب کے لحاظ سے، ملازمتوں میں اسامیاں مخصوص کر دی جائیں، تو اس پر بعض لوگوں نے

اعتراض کیا کہ ہمیں "روٹیاں بانٹنے" کے مطالبات کی پست سطح پر نہیں اُتر آنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ یہ سوال روٹیاں بانٹنے کا نہیں، ملازمتوں اور پارلیمانی نشستوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں جداگانہ قومیت کا احساس ہر وقت بیدار رہے گا اور یہ آپس میں کبھی مل نہیں سکیں گے۔ جداگانہ قومیت کا یہی وہ احساس تھا جو تقسیم ملک پر منتج ہوا۔ ملازمتوں اور پارلیمان کی نشستوں میں جداگانہ نیابت کا جو نتیجہ ہندوستان میں برآمد ہوا تھا، وہی نتیجہ یہاں مرتب ہوا۔ اس سے باہمی رقابت کے ایسے جذبات بیدار ہوئے کہ ہر خطہ میں بسنے والا مسلمان، اپنے آپ کو، دوسرے خطوں میں بسنے والوں سے ایک الگ وحدت محسوس کرنے لگ گیا۔ اگر یہی صورت حالات[1] باقی رہی تو پاکستان کے مسلمان کبھی ایک قوم کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکیں گے، اور مفادات باہمی کے تصادم کی خلیج بڑھتے بڑھتے معلوم نہیں کہاں تک لے جائے گی ان خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ پورے پاکستان میں وحدانی انداز (UNITARY FORM) کی حکومت قائم کی جائے جس میں مختلف علاقوں کی آبادی کی کوئی تخصیص نہ ہو اور انتظامی مقاصد کے لئے ملک کو ضلعوں اور کمشنریوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نہ کوئی صوبہ الگ ہو نہ اس کی پارلیمان جداگانہ۔ ملازمتوں کی اسامیاں، جو ہر ذاتی کے معیار پر پُر کی جائیں اور تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، افغانی کے امتیازات مٹ کر، قوم امت واحدہ کے قالب میں ڈھل جائے۔ اس کے سوا ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

۸۔ تشکیل حکومت

قرآن کریم، حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) سے بحث نہیں کرتا۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صدارتی نظام قرآنی تصور مملکت کے زیادہ قریب ہے[2]۔ اس میں امور مملکت سے متعلق فیصلوں کی ذمہ داری ایک فرد پر مرکوز ہو جاتی ہے جس سے بازپرس اور مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔ پارلیمانی نظام جمہوریت میں کوئی فرد کسی فیصلہ کا ذمہ دار، فلہذا مسئول قرار ہی نہیں پاتا۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں سربراہ مملکت ڈکٹیٹر نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اسلام میں آمریت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جب سربراہ مملکت ان حدود میں گھر جاتا ہے جو قرآن نے متعین کی ہیں تو اس کی آمریت ختم ہو جاتی ہے۔

اسلامی مملکت کی پارلیمان میں، حزب اختلاف کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو پارلیمان کے ممبر ہی نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہو جانا جن میں سے ایک پارٹی کا منصب ہی دوسری پارٹی سے برسر پیکار رہنا ہو

---

[1] یہ صورت حال باقی ہی نہیں رہی۔ پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گئی۔ (۱۹۸۳ء)

[2] لیکن یہ اس صدر کے متعلق ہے جو قرآنی حدود کا پابند ہو۔ اگر معیار یہ نہ ہو تو پھر صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی دونوں غیر اسلامی اور سیکولر ہوں گے۔ سیکولر حکومت میں پارلیمانی نظام بہتر ہوتا ہے (۱۹۸۳ء)

اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے پارٹیاں دو ہی ہیں۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان۔ یعنی ایک محمدؐ کی مجلس مشاورت اور دوسرا ابوجہل اور ابولہب کا وہ جتھہ جو حضورؐ کی مجلس مشاورت کا مخالف اور موافق گروہوں میں بٹے رہنا، قرآنی تصورِ اُمت کی نقیض تھا۔ باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے لیکن اُمت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا، یکسر غیر اسلامی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حزبِ مخالف کے بغیر جمہوری نظام قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جہنم میں جائے وہ نظام جس کا لازمی نتیجہ، امت کا متخالف اور متحارب گروہوں میں بٹے رہنا ہو۔

قوم میں بہرحال، عام علمی اور ذہنی سطح کے افراد بھی ہوں گے اور خاص صلاحیتوں کے مالک افراد بھی۔ مجلس مشاورت میں ان دونوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارلیمان کا دو ایوانوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا، آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ۔

پارلیمان، دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک ایوان، عام ابنائے ملت پر مشتمل اور دوسرا خاص صلاحیتوں کے اہل، اعیانِ اُمت پر۔

پارلیمان کے ایوانوں میں پارٹیوں کا وجود قانوناً ممنوع ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور حزبِ موافق اور حزبِ مخالفت کا غیر اسلامی تصور کارفرما نہیں ہوگا۔

۸۔ الف۔ اصولِ اہلیت

ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا..... (۴/۵۸) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو امانتیں تمہیں بطور امانت دیئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اس "اہلیت" میں، علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے کیونکہ قرآن کی رُو سے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوں اور وہ اپنے جذبات و خیالات کے پیچھے لگ جائیں، ان کا حکم نہیں مانا جائیگا سورۂ کہف میں ہے:۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)

تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوگیا اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے بڑھ گیا۔

قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ..... (۱۱/۴۶) جس کا عمل غیر صالح ہو جائے وہ بنیادی اہل میں سے نہیں رہتا۔ لہٰذا، مملکت کے افسرانِ ماتحت سے لے کر صدارتِ عظمیٰ تک، اہلیت، صالحیت اور تقویٰ (پاکیزگی سیرت) کی شرائط ہر ایک پر عاید ہوں گی اور معاشرہ میں مدارج جوہر ذاتی اور حسنِ کردار کی رُو سے متعین کئے جائیں گے۔

لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶/۱۳۲) ارشادِ خداوندی ہے۔ لہٰذا، آئینِ مملکت کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ،

صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ)، ارکانِ مجالسِ مقننہ، (پارلیمان) اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت اور ان دیگر افراد پر، جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں، حسبِ ذیل شرائط کا اطلاق ہو گا:۔

۱۔ قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

۲۔ متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی کما حقہٗ اہلیت۔

۳۔ صالحیت یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

۴۔ ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اس کا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا اسی طریق سے اسے معطل یا برطرف کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ ب۔ نظامِ تعلیم

قوم کا مدار، بڑھنے پھولنے پھلنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے اور یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی رُو سے، بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے والدین کے سر پر نہیں ہو گی بلکہ یہ حکومت کی اجتماعی ذمہ داری ہو گی۔ وہ مختلف مدارج پر بچوں کو چھلنے میں چھانتی چلی جائے گی اور ہر بچے کی مزید تعلیم کا انتظام اس کی ذہنی افتاد اور طبعی رجحان کے مطابق کرتی جائے گی۔

نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی تفریق ختم کر دی جائے گی جس کی رُو سے الگ مذہبی درسگاہوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طالب علموں کو علومِ عصرِ حاضر کی تعلیم اس انداز سے دی جائے گی کہ وہ جو مضمون بھی پڑھیں، اس میں دیکھ سکیں کہ قرآنِ مجید اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ ان کی تعلیم

از کلیمِ دیں در دنیا کشاد

کی عملی مثال پیش کرے۔ بنا بریں، قرآنی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ،

قوم کے بچوں کی (اوّل سے آخر تک) تعلیم کی ذمہ داری، انفرادی طور پر والدین کی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہو گی۔ نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائے گا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

۹- عدلیہ

اسلامی مملکت کا پورا انتظام، عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل میں عمرانی عدل بھی شامل ہے اور قانونی عدل بھی۔ جہاں تک عدلِ عمرانی کا تعلق ہے، قرآن کے اصول یہ ہیں:۔

۱۔ تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔
۲۔ ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔
۳۔ معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رُو سے متعین کی جائے۔
۴۔ ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری سونپی جائے۔
۵۔ بنیادی حقوقِ انسانیت کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔

لہٰذا، کوئی ایسا قانون یا طریقِ عمل جس کی رُو سے، پیدائشی نسبت کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق کیا جائے، غیر قرآنی اور غیر آئینی متصور ہوگا۔ واضح رہے کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں، مسلم اور غیر مسلم کے سلسلہ میں جو امتیاز کیا جاتا ہے، وہ اس اعتبار سے نہیں ہوتا کہ ایک شخص غیر مسلموں کے گھر پیدا کیوں ہوگیا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تو نہ کوئی مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ یہ امتیاز اس لئے روا رکھا جاتا ہے کہ غیر مسلم اس آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا جس پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جو مملکت بھی کسی آئیڈیالوجی کی بنا پر قائم ہو اس میں ان لوگوں کو شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں۔

جہاں تک قانونی عدل کا تعلق ہے، عدل کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ قانون کی رُو سے کیا جائے۔ یہ درست ہے لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خود قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اور اس کے نزدیک قانون کے مبنی بر عدل ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدود کے مطابق ہو۔ اس لئے اس نے عدل کی شرط یہ قرار دی ہے کہ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱)۔ الحق کے مطابق عدل کیا جائے۔ اور الحق سے مراد وحیٔ خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ مملکت کی عدالتِ عالیہ اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ ملک میں نافذ ہونیوالا قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ ملک میں ایک غلط (خلافِ قرآن) قانون نافذ ہو جائے اور بعد میں اسے عدالتوں میں چیلنج کیا جائے، یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ عدالتِ عالیہ پہلے ہی یہ دیکھ لے کہ مجوزہ قانون خلافِ قرآن نہیں۔ ہم نے اس مقصد کے لئے "عدالتِ عالیہ" کو اس لئے فیصلہ دینے والی اتھارٹی تجویز کیا ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں۔ اس میں جملہ امورِ مملکت کی طرف سے طے پاتے ہیں اور وہی قوانین کی تعبیر کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

عدل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا حصول بلا قیمت ہو۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی صورت کبھی عدل کہلا سکتی ہے کہ آپ کسی صاحبِ قوت سے جا کر کہیں کہ میں کمزور ہوں، اور فلاں زور آور میرا حق دبا کر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری مدد کریں اور میرا حق اس سے دلا دیں۔ وہ آپ سے کہے کہ مجھے پانسو روپیہ دو، تب تمہاری مدد کروں گا![1] اسلامی

[1] بطور رشوت نہیں بلکہ فیس کورٹ کی شکل میں

حکومت کا تو یہ فریضہ ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے اور حق دار کو اس کا حق دلا دے۔ ایسا کرنے میں مظلوم سے معاوضہ کس بات کا؟

اسلامی مملکت میں عدل کا تقاضا ایک اور بھی ہے۔ حکومت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جان، مال، عصمت، عزت، آبرو کی حفاظت کرے گی۔ اگر کسی شخص کا (اس کی اپنی غلطی یا غفلت کے بغیر) اس باب میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ،

۱۔ اس شخص کے نقصان کی امکانی تلافی کرے۔ اور

۲۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے تاکہ معاشرہ میں جرائم کی روک تھام ہو جائے۔

آپ سوچئے کہ ایک شخص کا ہزار روپیہ چوری چلا جاتا ہے اور حکومت، چور کو سال بھر کے لئے قید کر دیتی ہے، تو اس سے اس شخص کے ساتھ عدل کیا ہوا جس کا مال چوری چلا گیا تھا؟ چور کو سزا دینا، ظالم کے ساتھ عدل ہوا۔ مظلوم کے ساتھ نہیں۔ عدل، ظالم اور مظلوم دونوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

قرآنی عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے، نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی وہ معاشرہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھا جائے۔ تفتیش کے سلسلہ میں ملزم پر پولیس کا تشدد، یا عدالتی فیصلہ تک ملزم کو جیل خانہ میں محبوس رکھنا، عدل کے منافی ہے۔ اور بغیر مقدمہ چلائے کسی کو سزا دے دینا سراسر ظلم۔

قرآن کریم نے بعض جرائم (قتل، چوری، زنا اور بغاوت) کی سزا بھی مقرر کی ہے۔ یہ سزائیں کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق دی جا سکتی ہیں، اس کے متعلق قارئین کی توجہ اس مقالہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو طلوع اسلام کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔[1] قانون سازی کے سلسلہ میں وہ مقالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ خوف، خطرہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ مملکت اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ و مامون محسوس کریں اور امن پسند شہریوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ عدل کا بنیادی تقاضا ہوگا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) اسلامی معاشرہ میں کبھی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی کہ بوجھ کسی کا ہو اور اسے اٹھانا کسی اور کو پڑے۔ ہر شخص کو اپنا فریضہ آپ ادا کرنا ہوگا اور ہر فرد اپنے اعمال کے نتائج کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ اس میں نہ کوئی مجرم قصاص (جرم کے مواخذہ) سے بچ سکے گا اور نہ ہی کسی بے گناہ کو ستایا جائے گا۔ اس میں "کرے کوئی اور بھرے کوئی" کی دھاندلی بھی نہیں ہوگی اور قانون کی نگاہوں میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز بھی نہیں — حتیٰ کہ سربراہِ مملکت بھی قانون سے بالا نہیں سمجھا جائے گا۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲/۲۷۹) اس معاشرہ کا اصول ہوگا۔ یعنی نہ تم کسی پر زیادتی کرو، نہ تم پر کوئی زیادتی کرنے پائے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین میں یہ شق بھی ہونی چاہیئے کہ،

---

[1] حدود آرڈیننس کے ضمن میں بھی اس باب میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ (۱۹۸۳ء)

معاشرتی اور قانونی عدل، مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے اور ان کے عدم حصول کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے گا۔

قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ معاملہ کا فیصلہ قانون کی رُو سے ہوگا، اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

۱۰۔ نفسیاتی تبدیلی

لیکن معاشرہ کی اصلاح، تنہا قانون کی رُو سے نہیں ہو سکتی۔ قانون تو ان مستثنیات (EXCEPTIONAL CASES) کے لئے ہوتا ہے جن کی اصلاح، عقوبت کے خوف کے سوا کسی طرح سے نہ ہو سکتی ہو۔ معاشرہ کی اصلاح قلب و نظر کی تبدیلی سے ہی ہو سکتی ہے جس کا ذریعہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ قلب و نظر کی یہی وہ تبدیلی ہے جس سے انسان کے دل میں قانون کا احترام پیدا ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن اس باب میں کن گہرائیوں تک پہنچتا ہے جب کہتا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ۔ تیرے رب کی قسم! یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام متنازعہ فیہ امور میں تجھے اپنا حکم (فیصلہ دینے والا) تسلیم نہ کریں۔ اور اس کے بعد ان کی کیفیت یہ نہ ہو، ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ ۔ (جو فیصلہ تو دے) اس کے خلاف یہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵) اور یوں دل کے جھکاؤ کے ساتھ تیرے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں ـــ قانون کے مطابق فیصلہ کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کرنا، یہ ہے قلب و نگاہ کی وہ تبدیلی جس سے قانون کا صحیح احترام پیدا ہوتا ہے۔ اور قانون کا یہی احترام ہے جس سے معاشرہ کی اصلاح ممکن ہے ـــ معاشرہ کی اصلاح ہی نہیں، بلکہ قوم کے عروج و زوال، اس کی سرفرازی اور زبوں حالی کا دارومدار اسی نفسیاتی تبدیلی پر ہے کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔ (۱۳/۱۱)

(تم تو ایک طرف رہے) خدا بھی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے۔

افرادِ قوم کے اندر اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے جس سے قرآن کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو، نوجوانانِ ملت کے دل کا تقاضا بن جائے۔

۱۱- افراد اور مملکت کا تعلق

افراد اور مملکت کے باہمی تعلق کو قرآن کریم نے ایک آیت میں ایسی جامعیت سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں فکر و تعمق اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ... (۹/۱۱۱)

یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کے نفوس اور اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

یعنی خدا اور بندۂ مومن کے مابین بیع و شریٰ کا ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے، بندۂ مومن، اپنی جان اور مال، خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض، خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ بیع و شریٰ کا یہ معاملہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں۔ خدا کی طرف سے یہ معاملہ، وہ حکومت طے کرتی ہے جو دنیا میں خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے (اور جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے)۔ افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال حکومتِ خداوندی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور حکومت اس کا انتظام کرتی ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی میسر ہو اور آخرت میں بھی۔ "جنت کی زندگی" کی تفاصیل طویل ہیں لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ اس میں انسان کو ہر قسم کی خوش گواریاں اور سرفرازیاں اور اس کے ساتھ قلبی اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ (اخروی دنیا کی جنت اس پر مستزاد ہے)۔

یاد رہے کہ فسطائی نظام میں جو مملکت (STATE) کو معبود قرار دے کر، افرادِ معاشرہ کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، قرآن کے معاملۂ بیع و شریٰ میں یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اس میں افراد کو جو جنت کی زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے تو اس زندگی میں افراد، نہ کسی انسان کے محتاج ہوتے ہیں نہ محکوم۔ اس میں محکومی صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے اور نظامِ مملکت، ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار۔ لہٰذا، اس نظام میں، فسطائی نظام کا استبداد نہیں ہوتا جس میں افراد کی ہر قسم کی آزادی، سٹیٹ کی کالی ماتا کے استھان پر قربان کر دی جاتی ہے۔ یہ وہ آستانِ خداوندی ہوتا ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لہٰذا، اسلامی آئین میں ایک شق یہ بھی ہوگی کہ:

مملکت میں کوئی فرد نہ کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔ اس میں محکومیت صرف قانون کی ہوگی جس سے کوئی شخص بھی بالا نہیں ہوگا۔ مملکت، عدل و احسان کی عام کارفرمائی سے ملک میں ایسی فضا پیدا کرے گی جس سے قانون کا احترام افرادِ مملکت کے دل کی گہرائیوں کا تقاضا بن جائے اور اس طرح ہر شخص بلا خوف و حزن زندگی بسر کرے۔

۱۲۔ معاشی نظام

قرآن کریم نے کہا ہے کہ مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد یہ ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں دیں گے تو یہ۔

۱۔ اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کریں گے۔

۲۔ ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔

۳۔ ایسے قوانین کا نفاذ کریں گے جو قرآن کی رُو سے قابلِ قبول ہوں۔

۴۔ ان قوانین و رسوم کو منسوخ کر دیں گے جنہیں قرآن ناپسند کرتا ہو۔

۵۔ غرضیکہ ان کے تمام معاملات، پروگرامِ خداوندی کی تکمیل کے لئے ہوں گے۔

ان مقاصد میں سے ہم سردست "ایتائے زکوٰۃ" سے بحث کریں گے کیونکہ اسی کا تعلق موضوعِ زیرِ نظر سے ہے۔

زکوٰۃ ہمارے ہاں "ایتائے زکوٰۃ" کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے یعنی لوگ زکوٰۃ دیں گے اور زکوٰۃ سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ جمع شدہ مال و دولت سے، سال کے بعد، اڑھائی فی صد روپیہ نکال کر غریبوں کو دیدینا۔ ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم قرآنی نہیں۔ اوّل تو اس لئے کہ اس قسم کی (اڑھائی فی صد والی) زکوٰۃ کا قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی زکوٰۃ دینے کے لئے مسلمانوں کی اپنی حکومت کا ہونا لازمی نہیں۔ یہ زکوٰۃ تو ہم ہندوستان میں انگریز کی محکومی کے زمانے میں بھی دیا کرتے تھے اور ہندوستان کا مسلمان، ہندو کی محکومی میں رہتا ہوا، اب بھی دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ یہ "ایتائے زکوٰۃ" تو کوئی ایسا فریضہ ہے جو صرف اپنی آزاد مملکت ہی میں سرانجام دیا جا سکتا ہے بلکہ یوں کہیئے کہ یہ افراد کا نہیں خود مملکت کا فریضہ ہے[1] اور تیسرے اس لئے کہ قرآن کریم کی رُو سے مال و دولت جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں، اس لئے، جمع کردہ مال و دولت پر زکوٰۃ کا تصور صحیح نہیں ہو سکتا۔

"زکوٰۃ" کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، پھلنا، نشوونما پانا۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ جب دنیا میں جماعتِ مومنین برسرِ اقتدار آئے گی تو ان کی حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے۔ سامانِ نشوونما میں، انسان کی طبیعی زندگی کی ضروریات ــــ روٹی، کپڑا، مکان، آسائش، علاج معالجہ اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی برومندی کے لئے ضروری انتظامات، سب آجاتے ہیں۔ دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ۔ (۲۳/۴) ۔ یہ لوگ (مومنین) زکوٰۃ (سامانِ نشوونما بہم پہنچانے) کا انتظام کرتے ہیں۔ اصل یہ

---

[1] قرآن میں "ایتائے زکوٰۃ" حکومت کا فریضہ بتایا گیا ہے جس کا ترجمہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ "زکوٰۃ لینا" نہیں۔ اسلامی مملکت افرادِ معاشرہ کو زکوٰۃ (سامانِ نشوونما) دیتی ہے۔ لیتی نہیں۔ (۱۹۸۳ء)

ہے کہ نوعِ انسان کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو، اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے (اس کے بعد ۱۹۷۱ء کے مقالہ میں، قرآن کے معاشی نظام کا مختصر سا تعارف کرایا گیا تھا۔ لیکن اب چونکہ اس موضوع پر مستقل تصنیف "نظامِ ربوبیت" شائع ہو چکی ہے اس لئے اس حصہ کو مقالہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۸۳ء)

۱۳۔ غیر مسلموں کی پوزیشن

اس آئین کی شق ۴ میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کے افراد نہیں تسلیم کئے جا سکتے۔ اس لئے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے سے باہر کے انسانوں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر غور و فکر کریں، اور اس کے بعد اگر علیٰ وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (یعنی دل و دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوگا۔ (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)) یہ بھی قرآن کی مستقل قدر یا افرادِ مملکت کا بلا مشروط حق ہے۔ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۳۹/۴۱) ہم نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے۔ سو جو شخص (اسے قبول کر کے) سیدھی راہ پر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اسے ہی پہنچے گا اور جو غلط راستہ اختیار کرے گا تو اس کا نقصان بھی وہ خود بھگتے گا۔ اے رسولؐ! تو ان کے فیصلے اور عمل کا ذمہ دار نہیں (نہ ہی ان پر داروغہ مقرر کیا گیا ہے کہ انہیں زبردستی صحیح راستے پر لائے)

اس سے قرآن نے، اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریکِ کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۳/۱۹) جس کا جی چاہے اپنے رب کیطرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ "اذنِ عام" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ سورۂ فاطر میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں

حکومت عطا کی ہے "فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ" اگر کوئی شخص اس آئین و دستور کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت استوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس آئین مملکت (اسلامی آئیڈیالوجی) کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی قسم کے نقصان میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیئے اس لئے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں، ان میں برابر کا شریک ہونا چاہیئے۔ ایسا نہیں ہو سکتا اگر اس کے انکار سے اسے کچھ نقصان ہوتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۵/۳۹) اس انکار سے انہوں نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں، اس کے نقصان کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اس کا افسوس ضرور ہے۔ (يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (۳۶/۳۰) لیکن اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے، یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں، اس کا ازالہ کر لیں، اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو "قابلِ اعتراض" سمجھا جاتا ہے اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔ آئیڈیالوجی تو خیر بہت بڑی چیز ہے، عام جمہوری حکومتوں میں جو پارٹی برسرِ اقتدار ہو وہ مخالف پارٹی کے افراد کو شریکِ حکومت نہیں کرتی۔ اسلام کے معاملہ میں بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین درحقیقت اس کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے۔ جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ اس مملکت کے آئین کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوچیئے کہ دنیا میں کوئی مملکت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو شریکِ حکومت کر لے جو اس کے آئین کو تسلیم نہ کریں؟ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ اسلامی مملکت کا مقصد اور نصب العین تو قوانینِ خداوندی کی عملاً "تنفیذ" ہو اور اس مقصد کے حصول میں ان لوگوں کو شریک کر لیا جائے جو خود اس مقصد کے خلاف ہوں؟

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان و مال، عزت، عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا (۶۰/۸) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا (۵/۸) حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ مسلمانوں سے بھی زیادہ فائدہ میں رہیں گے کہ "کانٹے کے سینگ مسلمانوں کے سپرد ہوں گے اور اس کے دودھ میں یہ غیر مسلم بھی حصہ دار ہوں گے"۔ دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمان فوجیں، اپنے سینوں پر گولیاں کھا کر غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں گی۔ (۲۲/۴۰)

ان تمام سراعات کے باوجود اگر یہ غیر مسلم ترکِ وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹/۶)۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو یہ اس لئے کہ یہ لوگ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآن کریم کے تحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی (۵/۳۳-۳۴) بغاوت کی سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے۔ لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ:

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکیں گے کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے۔ ان کی جان، مال، آبرو پر ستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی، مذہبی آزادی ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرنے میں ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اس کے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کیطرف مستقل طور پر منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنے ہاں بسانے پر آمادہ ہو، تو اسلامی مملکت انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام کرے گی۔

لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین و قوانین سے سرکشی برتیں گے تو انہیں اس بغاوت کی وہی سزا دی جائیگی جو مسلمان باغیوں کے لئے مقرر ہوگی۔

۱۴۔ بنیادی حقوق

اصولاً ہر حق کسی نہ کسی ذمہ داری کے پورا کرنے کے نتیجہ میں قائم ہوتا ہے، مثلاً، مومن اور خدا کے مابین جس معاہدہ کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے (یعنی مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے) تو مومن جنت کا حقدار اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔ لیکن اس اصول میں بعض مستثنیات بھی ہیں جن میں حق، بغیر ذمہ داری کے واجب ہو جاتا ہے مثلاً جو شخص کام کرنے کے قابل نہ رہے، وہ مملکت سے سامانِ زندگی بطور حق طلب کر سکتا ہے (فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ

مَعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ) نیز بعض حقوق خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً جان کی حفاظت ہر فردِ معاشرہ کا حق ہے، لیکن جرمِ قتل کی سزا میں، اسے اس حق سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں حقوق کی کوئی الگ فہرست نہیں دی گئی۔ اس نے مستقل اقدار کا ذکر کیا ہے جن کا تحفظ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ انہی اقدار (یا مملکت کی ذمہ داریوں) سے حقوق مستنبط کئے جا سکتے ہیں[1] مثلاً

۱۔ احترامِ آدمیت

ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے" (۱۷/۷۰) اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ افرادِ مملکت کی قیمت متعین کرنے، (یعنی معاشرہ میں ان کا مقام مقرر کرنے) میں ان کی پیدائش (حسب و نسب) کے اعتبار سے کوئی تفریق و تخصیص نہیں کی جائیگی

۲۔ جنسی مساوات

قرآن کی رُو سے جنسی تفریق نہ وجہِ فضیلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں محض عورت ہونے کی حیثیت سے مردوں سے کمتر۔ فطری وظائف کے اعتبار سے ان کے فرائض زندگی میں فرق ضرور ہے لیکن جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رہیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔

۳۔ مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی

معاشرہ میں ہر فرد کا مقام اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی بنا پر متعین کیا جائے گا۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) قرآن کی مستقل قدر ہے۔ یعنی ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق۔ اسلامی مملکت میں تعینِ مدارج کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کا حق ہے کہ اسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق مقام عطا ہو۔

۴۔ حقِ آزادی

قرآن کی رُو سے آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔ (۳/۶۴) لا الٰہ الا اللہ اس آزادی کا منشور ہے۔ یعنی صاحبِ اقتدار صرف خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔

۵۔ عدل و احسان

عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ اور احسان کے معنی ہیں جس شخص میں کوئی کمی رہ جائے، اس کمی کا پورا کر دینا۔ عدل اور احسان، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے (۱۶/۹۰) اور افرادِ مملکت کا حق۔

---

[1] اس موضوع پر ایک خود مکتفی پمفلٹ الگ بھی شائع کیا جا چکا ہے۔ (۱۹۸۲ء)

۶۔ رزق (سامانِ زیست) کا حق

ہم دیکھ چکے ہیں کہ افرادِ معاشرہ کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے، فلہذا افرادِ معاشرہ کا حق۔ لیکن یہ حق مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ کام کرنے کے قابل ہر فرد، اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق وہ کام سرانجام دے جسے اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

سامانِ زیست میں وہ اسباب و ذرائع بھی شامل ہیں جو انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً تعلیم و تربیت۔ اسے ہر انسانی بچہ بطور استحقاق طلب کر سکتا ہے۔

۷۔ جان کی حفاظت

افرادِ معاشرہ کی جان کی حفاظت، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے لیکن جب جُرم کی پاداش میں سزائے موت دی جائے تو مجرم کا یہ حق سلب ہو جاتا ہے۔

اور جنگ کی صورت میں اپنی جانوں کو خود پیش کر دینا، مومنین کے اس معاہدہ کی شرط ہوتا ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

۸۔ مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہے جو مملکت کی اجازت سے افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ جو کچھ مملکت کی طرف سے کسی ایک فرد کے تصرف میں رہنے کے لئے دیا گیا ہے اسے دوسرا فرد زبردستی اپنے قبضہ میں لے لے۔ (۴/۲۹)

۹۔ سکونت کی حفاظت

ضروریاتِ زندگی میں، جن کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے، رہائش کا انتظام (مکان) خود بخود آ جاتا ہے اس لئے کسی کو سکونت سے محروم کر دینا اس کے اس حق کو سلب کر لینا ہے۔ (۲/۸۵)

۱۰۔ عصمت کی حفاظت

عصمت، انسان کا شرف ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کا حیوانات میں احساس تک نہیں ہوتا۔ لہٰذا، قرآن کریم اس کی حفاظت کو بنیادی اور غیر مشروط حق قرار دیتا ہے۔ (۲۴/۲ ; ۳۳/۳۳)

۱۱۔ شادی میں انتخاب کا حق

مرد اور عورت کے مابین، قوانینِ خداوندی کے مطابق، ازدواجی زندگی بسر کرنے کے معاہدہ کا نام نکاح ہے اور ظاہر ہے کہ معاہدہ کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن تاکید کرتا ہے کہ یہ معاہدہ فریقین کی رضامندی سے ہونا چاہیئے (۴/۳ ; ۴/۱۹) اور ظاہر ہے کہ جس طرح اس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین کو برابر کا حق حاصل ہے اسی طرح عندالضرورت اسے فسخ کرنے کا حق بھی فریقین کو یکساں طور پر حاصل ہوگا۔

۱۲۔ حُسنِ ذوق کا حق

قرآن، انسان کے انفرادی حُسنِ ذوق کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے اس کے اس حق سے محروم کر دے (۷/۳۲) حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سامانِ زیبائش و آرائش سے متمتع ہونا ہر فرد کا حق ہے۔

۱۳۔ مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآن ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے اس کے نزدیک ایمان نام ہے کسی بات کو عقل و فکر کی رُو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ ۲/۲۵۶) اس کا بنیادی اصول ہے اور ہر فرد کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ کفر اور ایمان میں سے جو راستہ چاہے آپ اختیار کرے۔ (۱۸/۲۹) اور جب جی چاہے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے۔ لہٰذا مذہب کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی مملکت کا اتنا ہی فریضہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں ہر ایک کو آزادی دے۔ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہل مذاہب کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرے (۲۲/۴۰) اور یہ دیکھے کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کی واجب الاحترام ہستیوں کی بے حرمتی نہ کرے۔ (۶/۱۰۸)

لیکن اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین (نظامِ زندگی) ہے جس کے مطابق اسلامی مملکت قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اس کی تو اجازت دیتا ہے کہ جس کا جی چاہے اس جماعت (امتِ مسلمہ) میں شامل ہو جائے جو اس مملکت کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جس کا جی چاہے اس میں شامل نہ ہو (غیر مسلم رہے)۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس مملکت کی حدود میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کر لیں۔ یہ تو ریاست درون ریاست (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔[1] نہ ہی اس کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ جس کا جی چاہے اس مملکت کے قوانین کی پابندی کرے اور جس کا جی چاہے ان سے انحراف کرے۔ قوانینِ مملکت سے انحراف جرم ہوتا ہے اور ان سے سرکشی، بغاوت۔ غیر مسلموں کو ان کے شخصی معاملات میں اپنے مذہب کی پیروی کی اجازت ہوگی، قوانینِ مملکت کے سلسلہ میں نہیں۔

۱۴۔ مظلوم کو فریاد کا حق

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہر مظلوم کو اس کا حق حاصل ہے کہ ظلم کی فریاد کرے (۴/۱۴۸) اس کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ اس کا بھی حق دیتا ہے (حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے کہ) ہر شخص حق اور انصاف کی شہادت دے، خواہ وہ کسی کے (بلکہ خود اس کے اپنے) خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (۴/۱۳۵)

۱۵۔ ملزم کا حقِ تکریم

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہو جائے، اسے بے گناہ سمجھا جائے۔ نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی اسے معاشرہ میں حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ سزا جرم کی ہوگی، الزام کی نہیں۔ (۲۴/۱۲ و ۲۴/۲۶)

۱۶۔ امن و اطمینان کی ضمانت

اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ نہ ہی انہیں خواہ مخواہ

---

[1] مملکت کے اندر دوسرا نظام قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لیکن (اگر کوئی بدنصیب چاہے تو وہ) اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر کے اقلیتوں کے زمرہ میں شامل ہو سکتا ہے (۱۹۸۳ء)

پریشان ہونا پڑے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۲۷۴) کی فضا پیدا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

۱۷۔ اپنی اپنی ذمہ داری

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۴) کوئی بوجھ اٹھانیوالا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اسلامی مملکت کا بنیادی شعار، اور افرادِ مملکت کا بنیادی حق ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا فریضہ سرانجام دینے کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکے گا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ حقوق جو (مشروط اور غیر مشروط طور پر) اسلامی مملکت کے افراد کو حاصل ہونگے ان کی ضمانت آئین کی رُو سے دی جانی ضروری ہے۔

حرفِ آخر

یہ ہیں ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس آئین کے بنیادی اصول جنہیں قرآن کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔ اس آئین کے سوا کوئی اور آئین، میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا۔ قرآن میں ہے: أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور ضابطۂ حیات اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا۔ (۳/۸۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً اسکے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے، انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو خدا کے قوانین کو بطور ضابطہ زندگی اختیار کر لے اور چاہے تو اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لیکن اسے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ،

مَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۳/۸۵)

جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا وہ دین (آئین) بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ آخر الامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کا ضابطۂ حیات، قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصور، یا قانون بار پا سکتا ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہو۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ۔ (۶/۱۱۵)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ سو تو اس باب میں جھگڑا کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اس آئین کے اصول ہر طرح سے مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۖ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۱۱۶)

اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئین خدا کی طرف سے عطا کردہ ابدی حقیقتوں پر مبنی ہے، انسانوں نے جو آئین و ضوابط بھی مرتب کئے ہیں (وہ موجودہ دور کے انسان ہوں یا سابقہ ادوار کے[1]) وہ حقیقت کے متعلق ظن و قیاس پر مبنی ہیں خواہ ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ملتِ اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدین کے سوا کسی اور آئین کا اتباع نہیں کر سکتی۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۶/۱۱۶)

اگر تو ان لوگوں کی بات مانتا جائے جو دنیا میں اکثریت سے ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے وہ (خود) ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں (اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی اندھیرے میں تاریک ٹوٹیاں مارتے رہتے ہیں)

اس لئے آئینِ خداوندی کو چھوڑ کر، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط کا اتباع کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اقوام کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کے ہاں کی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جا سکتی جو قرآن کے آئین اور نظام کے خلاف ہو۔ اسلامی آئین کی اصل و بنیاد صرف خدا کی کتاب ہے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (۲۱/۱۰۸)

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ آئین عطا کرتا ہے۔ اس لئے، اس کی رُو سے، اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ آپ کچھ اصول، قرآن کے اختیار کریں اور کچھ خارج از قرآن، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط سے مستعار لے لیں۔ ایسا کرنا شرک ہوگا۔ قرآنی آئین کو پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً (۲/۲۰۸) اس کا واضح ارشاد ہے۔ "کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور دوسرے حصے سے انکار کر دینا" ایسا جرم ہے جس کی سزا، اس دنیا کی ذلت و خواری اور آخرت کے عذابِ شدید کی شکل میں ملتی ہے۔ (۲/۸۵) لہٰذا یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی آئین کو بطور نصب العین سامنے رکھ کر، اس تک بتدریج پہنچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں بشرطیکہ یہ تدابیر بھی قرآن کے اصولوں کے مطابق ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی مملکت کے آئین میں کوئی ایسی شق رکھ لی جائے جو قرآنی اصولوں سے متصادم ہو۔ اس قسم کی ایک شق بھی، سارے کے سارے آئین کو غیر اسلامی بنا دے گی۔

اور اسلامی مملکت کا نظام، اپنے تدریجی مراحل میں ہو یا انتہائی منزل میں، صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکے گا جن کی سیرت خود قرآنی قالب میں ڈھلی ہو۔ بات خالی آئین اور قانون سازی کی نہیں۔ سیرت سازی کی بھی ہے۔

---

[1] فقہ بھی اسی لئے قرآن کا بدل نہیں ہو سکتی۔ (۱۹۸۳ء)

شاہد عادل

جماعتِ اسلامی اور علماء

(کالعدم)

(یہ جائزہ ۱۹۶۹ء میں لیا گیا تھا۔ اس کے بعد کے اضافے کسی دوسری نشست میں پیش کئے جائینگے۔ اس میں جماعت اسلامی کے ساتھ (کالعدم) اور مودودی صاحب کے نام کے ساتھ (مرحوم) کا اضافہ کر لیجئے)۔

پچھلے چند برسوں سے جماعت اسلامی کیطرف سے طبقہ علماء کو اپنے زیر اثر لانے کے لئے جو انتھک کوششیں ہو رہی ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ان کے پسِ منظر میں جھانک کر دیکھا جائے تو انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ ——— یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ——— وہ سوچتا ہے کہ وہی طبقہ علماء جو ان حضرات کے فیصلہ کے مطابق "اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا" کس طرح ان کا ہم نوا ہو جانے کے بعد "حق پرست علماء کا گروہ" بن جاتا ہے۔ وہ درسِ نظامی جس میں ان کی تحقیق کے مطابق "آٹے میں نمک کے برابر بھی دین نہ تھا" اور جو علماء اسے حاصل کرتے تھے وہ اپنے اردگرد دو سو برس پرانی فضا قائم کر لیتے تھے اور جس کی وجہ سے وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے یکایک "ٹھوس علمی قابلیت" پیدا کرنے کا نصاب بن جاتا ہے۔ وہ لوگ جن کی نظروں میں درسِ نظامی کی درسگاہیں تو کجا "ندوۃ العلماء" تک کبھی نہیں جچتا تھا، آج نہ صرف اپنے زیر اثر آنیوالی درسِ نظامی کی درسگاہوں کی فہرستیں شائع کر رہے ہیں، بلکہ "انصاف پسند مفتیوں" کے زیرِ نگرانی درسِ نظامی کی اپنی درسگاہیں قائم کر رہے ہیں۔ وہ علماء جنہیں اراکینِ جماعت کے مشورہ کے باوجود، امیرِ جماعتِ اسلامی براہِ راست خط و کتابت کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ آج جماعتِ اسلامی کی طرف سے ان کے لئے ایک خصوصی ادارہ "اتحاد العلماء" قائم کیا جا چکا ہے۔ ائمہ فقہ کی جس تقلید کو "گناہ سے بڑھ کر" یعنی کفر بتایا جاتا تھا، آج خود جماعتِ اسلامی اس کی علمبردار بن چکی ہے۔ حنفی فقہ کی معتبر ترین کتابیں جن کے متعلق استہزاءً کہا جاتا تھا کہ قیامت کے دن یہ کسی کو پناہ نہ دینگی، آج انہیں کو ملک کا قانون قرار دینے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ وہ علماء جنہوں نے "حجروں کی تنگ دنیا" میں رہتے ہوئے اسلام کو "غیر متحرک" اور جامد مذہبیت میں تبدیل کر دیا تھا آج وہ ملتِ اسلامیہ کی تقدیر بدلنے والے قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ملک کے دور دراز کونوں میں خاموش تبلیغ کرنے والے علماء جو ان کی بارگاہ سے "بدھ مت کے بھکشو" کا خطاب پا چکے تھے "اتحاد العلماء" کی فہرستوں کی زینت بننے لگے۔ اور وہ لوگ جن کے متعلق یہ فرمایا جاتا تھا کہ "جبوں اور عماموں میں سیاہ دل چھپے ہوئے ہیں" آج "انبیاء کے وارث" کے نام سے خطاب کئے جا رہے ہیں۔

قارئین، اس قدر تضاد کو دیکھ کر یقیناً چونک اٹھے ہونگے۔ لیکن ذرا صبر سے کام لیجئے۔ ان تضادات کی تفصیل

ہم ابھی آپ کی خدمت میں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کو پیش کرنے سے پہلے ہم عام قارئین اور خاص کر علماء حضرات کے غور و فکر کے لئے اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے مسلک میں ایسی حیرت انگیز انقلابی تبدیلی کچھ یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ ایسا خاص مقاصد کے ماتحت کیا گیا ہے۔ یہ مقاصد آئندہ صفحات میں علماء اور جماعت اسلامی کی کش مکش کی تفصیلات کے دوران خود بخود واضح ہوتے جائینگے اس لئے انہیں ذرا غور سے دیکھئے۔

مسلمانوں کی تمام جماعتیں جنسِ کاسد ہیں

مولانا مودودی صاحب جس وقت سیاسی میدان میں اُترے تو بدقسمتی سے قوم کی سربراہی کی تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی برتری کا سکہ جمانے کے لئے اُس وقت کی جماعتوں کو جنسِ کاسد قرار دے دیا۔ یہ "تاریخی فیصلہ" انہی کی زبانی سنیئے۔ انہوں نے تحریر فرمایا:۔

"اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر رہنما[1] یا علمائے دین و مفتیانِ شرعِ مبین۔ دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔"

(ترجمان القرآن۔ جلد ۱۷ عدد ۴ صفحہ ۴۹۲/۸۴)

اس جنسِ کاسد کی تھوڑی سی تفصیل انہی کی زبان سے سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:۔

جُبّوں اور عماموں میں سیاہ دل

"پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی اونی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے، کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جُبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدگفتاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں اور غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔ جمہور مسلمان بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔"

(تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ صفحہ ۱۰۳)

لیکن اتنی سی بات کہہ دینے سے سربراہی کی کرسی تھوڑی مل جاتی ہے؟ اس کے لئے مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کو دیگر جماعتوں میں کیڑے ڈالنے کے لئے پوری طاقت سے جنگ کرنی پڑی۔ یہ جنگ علماء کے کسی ایک گروہ کے خلاف نہ تھی بلکہ ان کی ہر جماعت اس حملہ کی زد میں تھی۔ پہلے یہ ملاحظہ فرمائیے کہ ساری اسلامی دنیا کے علماء کے بارے میں جماعت اسلامی کی کیا رائے تھی۔ بات یوں ہوئی کہ علامہ موسیٰ جار اللہ (مرحوم)

---

[1] قائدِ اعظمؒ اور ان کے رفقاء سے مراد ہے۔

علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں

نے جماعت اسلامی والوں کو علمائے ہند کے بارے میں ایک مراسلہ بھیجا جو "ترجمان القرآن" میں چھپا۔ اس مراسلے کے نیچے مودودی صاحب کی طرف سے یہ نوٹ دیا گیا تھا۔

"علامہ نے ان سطور میں علمائے ہند کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ملامت و تحقیر کے وہ سزاوار ہیں۔ لیکن نہایت ادب کے ساتھ ہم اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علماء نہیں ہیں، بلکہ اس باب میں تمام عالم اسلامی کے علماء کا حال یکساں ہے۔ ہر جگہ کے مدارس میں قرآن متروک و مہجور ہے۔ ہر جگہ اس گروہ میں انانیت، کبر، خود پرستی کی وہی بیماریاں ہیں جو علامہ کو یہاں کے علماء میں نظر آ رہی ہیں۔ علم و تحقیق کی خواہش اور اس کی قدر و حق شناسی بھی ہر جگہ مفقود و معدوم ہے اور تبادلۂ افکار اور تعاونِ آراء کے ذریعے رفع نزاع اور تحقیق کی تمنا جو علامہ نے ظاہر فرمائی ہے، اس کا بھی کہیں سراغ نہیں لگتا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کے علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے اور قدرت کی طرف سے ان جرائم کی جو سزا مقرر تھی وہ ان کو مل چکی۔"

(ترجمان القرآن۔ جنوری، فروری ۱۹۴۵ء صفحہ ۷۷)

صدیوں کے جمود کا نقصان

علماء کے جمود کی وجہ سے امت کو جو نقصان اٹھانا پڑا، اس کی نشاندہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ درحقیقت یہ علماء ہی کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتداء ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی سمجھتے، مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ (مغربی) تہذیب اُٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کارآمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے اور ان نئے کل پرزوں کو اصولِ اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہنچا تھا، اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علماء (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی۔ ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسولؐ خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانہ کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ وہ ہر معاملہ میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے۔ کہ ان کی بصیرت اوقات و حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔"

(تنقیحات۔ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب صفحہ ۲۷)

سلہ مراد حنفی فقہ کی کتابیں ہیں ۱۲

سلہ مراد حنفی ائمہ ہیں ۱۲

علماء کے اردگرد دو سو برس پرانی فضا

"تنقیحات" سے جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے، اسی کے تسلسل میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

"بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے جس کی وجہ سے ابتداء میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوئی ہے اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اپنے اردگرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں سوچتے ہیں۔ اسی میں رہتے ہیں۔ اور اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں۔" (ایضاً۔ صفحہ ۲۸)

علماء نے اسلام کو جامد اور غیر متحرک بنا دیا ہے

پھر اسی کتاب میں آگے چل کر (صفحہ ۱۱۸) پر لکھتے ہیں:۔

"صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھوں میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی ساتویں ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی موقوف ہو گئی ہے۔ وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں تو یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانے کی تیزگی اور وقت کے سیلان و تجدد سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا۔ انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی۔ نئے تغیرات سے بے اثر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں۔ بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ لیں۔"

جمود کی خرابی کی جڑ

علماء کی اس روش کو بیان کرنے کے بعد مودودی صاحب اس چیز پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس تمام خرابی کی جڑ ہے۔

"اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی۔ اور ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل اسلام قرار پا گئے۔ حالانکہ اسلام میں ان کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔ ملت اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد۔ لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو الٹ دیا گیا اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہل بصیرت کا اجتہاد، پھر سنت رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم . . . .

. . . . اور سب سے آخر میں قرآن ہی

کی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن و غیر متحرک شئے بنا دیا ہے ..... مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی، جب آنکھیں بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی، جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا، جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم ترک کر دیا گیا اور جب کتاب و سنت کے اصول چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنا لئے گئے، تو اسلام کی ترقی دفعتہً رک گئی۔ اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک ہو گئے۔ جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے۔ نئے نئے مذاہب نکالتے اور دور از کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے۔ اور اس دریا دلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر و فسق تقسیم کیا گیا کہ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔ کی جگہ يَخْرُجُونَ مِنْ دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا تماشہ دنیا نے دیکھا۔" (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۰)

حجروں کی تنگ دنیا اور علماء کے مشاغل

پھر جون ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں "سب سے اصل فتنے" کے زیر عنوان علماء کے مشاغل کی جھلک یوں دکھاتے ہیں:-

"یہ نمونہ ہے اُن فضول، لایعنی اور لاطائل جھگڑوں کا جن میں ہمارے بہت سے علماء دین اور بہت سے دیندار لوگ نہ صرف خود اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں بلکہ عام مسلمانوں کے ذہن کو بھی اس بری طرح سے اُلجھا رہے ہیں کہ ان غریبوں کو دین کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ان لوگوں کی دنیا تنگ اور محدود ہے اور اس تنگ دنیا میں بیٹھے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی اور ساری دنیا کی فلاح کا مدار بس اس قسم کے سوالات پر ہے کہ حضرت مریمؑ کو گرمی کا میوہ جاڑے میں ملتا تھا یا نہیں اور لوہا حضرت داؤدؑ کے ہاتھ میں آتے ہی موم بن جاتا تھا یا نہیں۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ انہیں ان کے حجروں کی تنگ دنیا سے نکال کر خدا کی وسیع دنیا کا مشاہدہ کرایا جاتا اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہ حقیقی مسائل کون سے ہیں جن پر نوع انسانی کی فلاح و سعادت کا انحصار ہے۔"

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صـ۱۳۰)

افسوسناک امر

اسی تحریر کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

"سب سے بڑھ کر افسوسناک امر یہ ہے کہ ان مسائل میں مغز پاشی کرنے والے ایسے لوگ ہیں جو ہمارے دین کے عالم اور ملت اسلامیہ کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ مسلمان ان کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ ان کے پاس سے دین کا علم ملے گا۔ دنیا ان کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ یہ اس دین کے نمائندے ہیں جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ مگر اس اہم ذمہ دارانہ منصب پر متمکن ہو کر وہ اسی قسم کے مسائل پہ زبان و قلم کا زور صرف کر رہے ہیں جن کا چھوٹا سا نمونہ اوپر کے سوال میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ باتیں دیکھ کر مسلمان اور غیر مسلم سب اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اسلام کے مہمات مسائل یہی ہیں۔" (ایضاً۔ صـ۱۳۱)

علماء کا اہم مشغلہ کافرگری

"انہوں نے اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول بنائے بیٹھے ہیں جن کو انہوں نے خود یا ان کے اسلاف نے اپنے مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو نصوص سے معانی اخذ کرنے میں ان کے گروہ نے اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کافر قرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی کھینچ تان اور بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کی یہ کافرگری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علماء کی طرف سے بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جن کی نمائندگی یہ علماء کرتے ہیں۔ روز بروز علماء کا اقتدار مسلمانوں پر سے اُٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل مذہب کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے دور بھاگتے ہیں۔ مذہبی مجلسوں اور مذہبی تحریروں کے متعلق یہ عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں فضول جھگڑوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۵۲)

علماء اور فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل

"مگر عام طور پر علماءِ دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلافات کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کے جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا۔ معقولات کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن و حدیث سے نہ خود ذوق رکھا نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے لوگوں کی نگاہیں خوردبین بن کر رہ گئیں، دوربین و جہاں بین نہ بن سکیں۔ آج یہ پوری میراث جھگڑوں اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روز افزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کے ساتھ ہمارے حصہ میں آئی ہے۔"

(اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔ از مولانا مودودی صاحب۔ صفحہ ۴۴۳، ۴۴۴)

علماء میں جمود کی وجہ

علماء کا یہ طرزِ عمل تھا جس کی وجہ سے ان میں ذہنی جمود پیدا ہوا۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:-

"اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علومِ اوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرفِ آخر ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی علمی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے پر ردّے چڑھائے جائیں۔ ان ہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنفین اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرسین مشغول رہے۔ کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیق، کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے قریب کی ان صدیوں میں ہمارے ہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔"

(ایضاً ص ۴۴۳)

درسِ نظامی میں آٹے میں نمک برابر بھی دین نہیں

قارئین خود اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس نظامِ تعلیم نے ہمارے علماء کو اس حد تک پہنچا دیا ہو، جماعتِ اسلامی کی طرف سے اس کے حق میں کیا کچھ نہ کہا گیا ہو گا چنانچہ انہوں نے علماء کے خلاف مہم میں اس درسی نظامِ تعلیم کو بھی (جسے درسِ نظامی کہتے ہیں) خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ پہلے ملاحظہ ہو کہ ان کی تحقیق کے مطابق درسِ نظامی کی کتابوں میں دین کا حصّہ کتنا ہے۔ نومبر ۱۹۵۱ء کے ترجمان القرآن میں ہمیں ان کی یہ تحقیق ملتی ہے۔

"مولانا اس بد دماغی کی بھی تو خبر لیں جو مدّتوں سے ہمارے دینی مدرسوں میں پرورش پا رہی ہے کہ نصاب کی چند کتابیں الٹی سیدھی پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو دین کا مختارِ کل سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں میں دین کا حصّہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا آٹے میں نمک کا۔" (صفحہ $\frac{97}{25}$)

درسِ نظامی

اب علماء کے اس نظامِ تعلیم یعنی درسِ نظامی کی پوری تصویر انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔

"جہاں تک ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کا تعلق ہے وہ آج سے صدیوں پہلے کی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس وقت یہاں انگریزی حکومت آئی اور وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے اس وقت جو نظامِ تعلیم ہمارے ملک میں رائج تھا وہ ہماری اس وقت کی ضروریات کے لئے کافی تھا ...... لیکن جب وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے تو اس پورے نظامِ تعلیم کی افادیت ختم ہو گئی ...... اب جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں، اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔"

(تعلیمات ـ از مولانا مودودی صاحب صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹)

درسِ نظامی کے فارغ التحصیل اسلام کے صحیح نمائندے نہیں

مولانا کی یہ تقریر جو انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی، بڑی طول طویل ہے جس کا پورے کا پورا نقل کرنا مشکل ہے۔ لہذا مقصد زیرِ بحث کی وضاحت کے لئے اس میں سے ایک دو مزید اقتباسات دیئے جاتے ہیں:

"ان درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلباء نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں۔ اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی اس میں کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعہ سے ہو رہی ہے اسکی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بُعد بڑھتا جا رہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آ رہی ہے۔ پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ کیونکہ ان کی ضروریاتِ زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سر سے

ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔"

(ایضاً۔ صفحہ ۱۳۹-۱۴۰)

ان کی زبانوں میں ڈنک ہے

ان جھگڑوں میں علماء حضرات زبان کس قسم کی استعمال کرتے ہیں، اس کے متعلق بھی مودودی صاحب کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لئے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کے لئے آپ کو علماء ہی کے طبقے کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور باستثناء چند اس طبقے کے سواد اعظم کا حوصلہ ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبہ دینے کا موقع دیا تو یقین جانیئے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ وہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند نہ اہل چھوٹی چھوٹی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں اس لئے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔" (تنقیحات صفحہ ۲۸)

اس کے بعد آپ پھر اسی درس نظامی کی طرف آیئے جس پر مودودی صاحب کی تنقید آپ کے سامنے آرہی تھی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں لکھا تھا:۔

درس نظامی میں کیا پڑھایا جاتا ہے

"کوئی عربی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کے نصاب تعلیم میں پورا قرآن مجید داخل ہو۔ صرف ایک یا دو سورتیں (سورۃ بقرہ یا سورۃ آل عمران) باقاعدہ درساً درساً پڑھائی جاتی ہے۔ باقی سارا قرآن اگر کہیں شامل درس ہے بھی تو صرف اس کا ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ تحقیقی مطالعہ قرآن کسی مدرسے کے نصاب میں شامل نہیں۔ یہی صورت حال حدیث کی ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ تعلیم جیسی کہ ہونی چاہیئے، جیسی کہ محدث بننے کے لئے درکار ہے، کہیں نہیں دی جاتی۔ درس حدیث کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے وہ یہ ہے کہ جب فقہی اور اعتقادی جھگڑوں سے متعلق کوئی حدیث آجاتی ہے تو اس پر دو دو تین تین دن صرف کر دیئے جاتے ہیں۔ باقی رہیں وہ حدیثیں جو دین کی حقیقت سمجھاتی ہیں یا جن میں اسلام کا معاشی اور سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی نظام بیان کیا گیا ہے، یا جن میں دستور مملکت یا نظام عدالت یا بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہے۔ ان پر سے استاد اور شاگرد دونوں اس طرح رواں دواں گزر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی بات قابل توجہ ہے ہی نہیں۔ حدیث اور قرآن کی بہ نسبت ان کی توجہ فقہ کی طرف زیادہ ہے لیکن اس میں زیادہ تر بلکہ تمام تر جزئیات فقہ کی تفصیلات ہی توجہات کا مرکز رہتی ہیں۔ فقہ کی تاریخ اس کے تدریجی ارتقاء، اس کے مختلف سکولوں کی امتیازی خصوصیات، ان سکولوں کے متفق علیہ اور مختلف فیہ اصول اور ائمہ مجتہدین کے طریق استنباط سے جانے بغیر کوئی شخص حقیقت میں فقیہ نہیں بن سکتا، ان کے درس میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان چیزوں پر شاگرد تو درکنار استاد بھی نگاہ نہیں رکھتے۔" (ایضاً صفحہ ۱۴۱)

دینی مدارس کو عملی مسائل سے الگ رکھا جاتا ہے

پھر ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۰ء میں جدید تعلیم کے نقائص بیان کرنے کے بعد درس نظامی کی درس گاہوں کی یوں خبر لیتے ہیں:۔

"بعینہٖ اسی طرح دینی مدارس میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ دینی علوم کو دنیا کے بڑے بڑے اجتماعی اور عملی مسائل سے بالکل الگ کرکے پڑھایا جاتا ہے اور جو طلباء دین کے لئے زندگیاں وقف کرتے ہیں وہ سائنس، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، سیاست، معاشیات، حفظانِ صحت اور معلوماتِ عامہ کے لحاظ سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارا مذہبی نظامِ تعلیم ان علوم کو دینیات کے دائرے سے باہر جگہ دیتا ہے۔" (صفحہ ۳/۴)

درس نظامی کے استاد۔ ذہنی پستی اور طباع کا افلاس

یہ درس نظامی کس قسم کے علماء پیدا کر رہا ہے، یہ بھی انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

"پھر ذرا آپ چراغ لے کر وہ مقدس چہرے ڈھونڈ کر دکھا دیجئے جو طلباء کو دین کے اسرار سے آگاہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کیا کوئی ایک ادارہ ایسا ہے جس میں اسلامی نظام زندگی کی تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا گیا ہو؟ جس ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونیوالا ہے اس میں یہ ذہنوں کی پستی، طباع کا افلاس اور ہمت کی کمزوری کا روشن ثبوت ہے کہ آج بھی ہمارے ائمہ مساجد دعوت دیتے ہیں کہ آؤ تعلیم دین خطرے میں ہے۔ ہمارے مدرسے کی مدد کرو۔ اور پھر بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں اتنا چندہ ملا۔ کیا اس ملک میں قرآن کا نظام قائم ہوگا جس میں آج تک ہمارے ناظمین مدارس دینیات کو اس سے نجات نہ مل سکی کہ وہ در بدر پھر کر تعلیم دین کے لئے چندہ جمع کریں۔" (ترجمان القرآن بابت جولائی تا ستمبر صفحہ ۲۸۹/۳۲۵)

شاید کسی کے ذہن میں یہ بات ہو کہ کیا دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسے علماء ساز ادارے بھی اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس کا جواب بھی انہی کی زبانی سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

دار العلوم دیوبند اور عام جمود

"اور اسی طرح ملک کے جس حصے میں بھی کوئی مدرسہ قائم ہوا، عام جمود اور مسائلِ حیات سے فرار کی پالیسی میں اس کی روش دیوبند کے نقشِ قدم پر رہی۔" (ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۳۳۴/۵۹)

ندوۃ العلماء اور "جامعہ ازہر" کو بھی درس نظامی پر کوئی فوقیت نہیں

درس نظامی کی اصلاح کے لئے "ندوۃ العلماء" کا دار العلوم قائم کیا گیا لیکن وہ بھی ان کے ہاں سے شرفِ قبولیت حاصل نہ کرسکا۔ چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی انجمن اتحادِ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آپ کی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان کے ہاں علم محض علومِ اوائل کے پڑھانے تک محدود ہے "ندوۃ" اور "ازہر" نے اصلاح کی طرف قدم بڑھایا مگر اسکا حاصل صرف اس قدر ہے کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جائے۔ بصر اور فواد ابھی معطل کے معطل ہی رہے۔ اس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی بڑھیا قسم کے مقلدی بن جائیں۔" (تعلیمات۔ صفحہ ۳۳)

درس نظامی کے مقابلے میں مولانا مودودی کا مثالی علم

قدرتاً نگاہیں اس بات کی منتظر ہوں گی کہ اگر یہ سب نظام چھائے

تعلیم اس حد تک خراب ہو چکے ہیں تو مثالی تعلیم کا نمونہ کیا ہو سکتا ہے۔ مودودی صاحب جماعت اسلامی کی طرف سے علماء کے مقابلے میں ان کی یہ تصویر ہمارے سامنے لائی جاتی ہے۔

"مولانا مودودی صاحب کوئی اکیڈیمک طرز کے مصنف نہیں ہیں کہ انہوں نے مجرد علمی خدمت کے لئے زندگی سے غیر متعلق مسائل پر خامہ فرسائی کی ہو۔ وہ کوئی ناقل قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ایک خاص مسلک کی عربی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کو اپنے الفاظ میں اردو میں منتقل کر دیتے ہوں۔ وہ کوئی جامد اور مقلد قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ان کا سارا تصنیفی کارنامہ مکھی پر مکھی مار دینا ہو۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کے وہم میں بھی مبتلا نہیں کہ ان کا سارا زور "قلم" "غسل و وضو" کے مسائل تک محدود ہو۔ وہ ایک داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں، دعوت و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے دین کی متعدد ایسی حقیقتوں کو برملا آشکارا کیا ہے جو اگرچہ دین کی نہایت ثابت و معروف حقیقتیں رہی ہیں لیکن اس دور زوال میں ان کو اس وضاحت کے ساتھ کہنے کی ہمت لوگ کھو بیٹھے تھے۔ اس اصلاح کے مقصد کی خاطر ان کو صرف مسلمانوں کے گمراہ فرقوں ہی پر نہیں بلکہ ان فقہی گروہوں پر بھی تنقید کرنی پڑی ہیں جو صحیح بنیاد پر ہونے کے باوجود بہت سی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہیں ان لوگوں سے بھی لڑنا پڑا ہے جو بے جا تعصبات اور تقلید جامد کی بندشوں میں گرفتار ہیں۔ انہیں دین کے صحیح تصور اور اس کے نظام کے احیاء کی خاطر ان لوگوں سے نبرد آزمائی کرنی پڑی ہے جو موجودہ معاشرے کی قیادت کر رہے ہیں۔ الغرض انہوں نے جب سے قرطاس و قلم کا مشغلہ اختیار کیا ان کو اپنے گرد و پیش سے ایک چومکھیا لڑائی لڑنی پڑی ہے۔ حنفی اور اہلحدیث، بریلوی اور دیوبندی، صوفی اور ملا، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور قادیانی، منکر حدیث اور منکر شریعت، نیشنلسٹ اور کمیونسٹ، کانگریسی اور مسلم لیگی، غرض کوئی ایسا نہیں ہے جس پر ان کو تنقید نہ کرنی پڑی ہو اور وہ ان کے لٹریچر کے کسی نہ کسی حصہ سے بیزار نہ ہو۔" (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۳۰/۵۸)

مسخ شدہ مذہبیت

یہی وجہ تو ہے کہ وہ قدم قدم پر امت مسلمہ کی "رہنمائی" کا فریضہ اکیلے سرانجام دے رہے ہیں کیونکہ درس نظامی تو مسخ شدہ مذہبیت ہی کو رواج دے سکا جس نے اسلامی شریعت کو منجمد شاستر بنا دیا ہے۔ چنانچہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں اس مسخ شدہ مذہبیت کے نقائص گناتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اسلامی شریعت کو منجمد شاستر بنا دیا ہے

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جتنی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ وہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدر شناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لئے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

جزئیات کی ناپ تول

"تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول مقداروں کے غیر منصوص

تعین اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس غلط ذہنیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں۔ اسلام کے راستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مگر یہ اسلام کا تصور نہیں ہمارا اپنا تصور ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے اس نظامِ تعلیم کو بدلیں جس نے دنیا کے تصور کو آشنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔" (مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۹۶، ۱۹۷ء)

مقداروں کا غیر منصوص تعین

یہ جو بار بار چھوٹی چھوٹی چیزیں، جزئیات کا ناپ تول، مقداروں کا غیر منصوص تعین اور روح سے بڑھ کر مظاہرِ دین کو اہمیت دینے کی اصطلاحات بار بار استعمال ہو رہی ہیں تو ہم اس کی وضاحت کے لئے اس خاص مسئلہ کو سامنے لاتے ہیں جس کی وجہ سے جماعتِ اسلامی کے امیر کو بار بار یہ الفاظ کہنے پڑ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ تھا ڈاڑھی کی منصوص مقدار کا جس پر امیر جماعتِ اسلامی اور جماعت میں داخل ہونے والے دوسرے علماء کے درمیان بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں۔ اس عملی مثال کے سامنے آجانے کے بعد قارئین بھی ان اصطلاحات کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔

داڑھی سنت نہیں بلکہ عادت ہے

ایک وقت تھا جب مودودی صاحب خود داڑھی منڈاتے تھے۔ رئیس احمد صاحب جعفری ندوی (مرحوم) نے اس کی جھلک ہمیں اپنی کتاب "دید و شنید" میں یوں دکھائی ہے۔

"۳۳ء کی ایک سرو شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی۔ میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علیگڈھ کٹ پائجامہ، حیدرآباد وضع کی شیروانی۔ ڈاڑھی ندارد، غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئیں۔ انگریزی تراش کے بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے۔ میں نے مولانا عرفان سے پوچھا۔ آپ کی تعریف۔ فرمایا۔ ابوالاعلیٰ مودودی"۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں، یعنی جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھنے کے بعد، مودودی صاحب نے کچھ ڈاڑھی بڑھائی۔ علماء کے اعتراضات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی مقدار اتنی ہی تھی جتنی عام طور پر جماعتِ اسلامی کے لوگوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ یعنی دُور سے دیکھنے سے ڈاڑھی معلوم ہو، چاہے اس کی مقدار کتنی چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ علماء نے ان کی اس روش پر سخت اعتراض کیا لیکن مودودی صاحب کا فرمان تھا کہ شریعت سے یہی کچھ ثابت ہوتا ہے، اور علماء جو مشت بھر ڈاڑھی کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ مقدار غیر منصوص ہے، اور پھر جو لوگ، ان کی تحقیق کے مطابق، اس غیر منصوص مقدار پر زور دیتے ہیں آپ سے مودودی صاحب بدعت اور تحریفِ دین قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب کے جواب سے پہلے، جماعتِ اسلامی سے متعلق کسی صاحب کی وہ گزارش ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے ان کی خدمت میں کی تھی۔

داڑھی بڑھانے کی گزارش

"دوسری گزارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحتِ شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہرِ سنن کی تغیر و تبدیل پر ابتداً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرز اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش و تنفر پیدا ہو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتلِ منافقین اور تعمیر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اعفاء اور تقصیر لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو

طرزِ عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادھر مقدارِ قبضہ تک اعفاء کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا پھر کیا یہ مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لئے آپ بھی اسی جواز پر عمل کر لیں۔ کیونکہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے اس کی اصلاح بنیادی امور اور مہمات مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہو سکتی ہے جماعتِ اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ غور فرمائیں گے۔"

(ترجمان القرآن۔ بابت مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۲۶۹/۱۷۳)

ڈاڑھی کی مقدار کو منصوص قرار دینا بدعت اور تحریف دین ہے

مودودی صاحب نے اس گزارش کا جو جواب دیا

اب وہ ملاحظہ فرمائیں۔

"ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک کی نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے۔ اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریف دین کی موجب ہوئی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دیدی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کہ منصوص چیز پر ہونا چاہیئے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کیلئے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ درآں حالیکہ جو امور آپ نے عادۃً کیئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ تحریف جو دین میں کی جا رہی ہے اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع و قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میرے نزدیک میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہونگا جس کے لئے اللہ کے یہاں مجھ سے سخت باز پرس ہوگی۔ اور اس باز پرس میں کوئی میری مدد کے لئے نہ آسکے گا۔ لہٰذا، میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اُخروی خطرے میں ڈالوں۔"

(ترجمان القرآن۔ ایضاً صفحہ ۲۷۱/۱۷۵) (جاری)

اسلامی معاشرت

پرویز صاحب کی اس عام فہم کتاب میں زندگی کے روزمرہ کے امور کے متعلق قرآنی احکام ایسے سلیس اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں کہ اس سے بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بڑی آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے یکے بعد دیگرے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت -/۶ روپے علاوہ محصول ڈاک

حقائق و عبر

حقِ حکومت

صرف جماعت اسلامی ہی پاکستان میں حکومت کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ جماعت کے ارکان ہی اسلامی نظریات اور شریعت پر کاربند ہیں۔ (میاں طفیل محمد۔ بحوالہ روزنامہ جنگ (لاہور) مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۸۳ء)

جی نہیں!

اقتدار ہمیں ملے گا۔ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے۔

(پیر پگاڑا۔ بحوالہ جنگ (لاہور)۔ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۳ء)

صرف قرآن

ماہنامہ محدث (لاہور) فرقہ اہلحدیث کا ترجمان ہے۔ اس نے اپنی اشاعت بابت اگست ۱۹۸۳ء کے اداریہ کا عنوان دیا ہے ــــ یوم آزادی کا اعلان۔ ہمارا دستور قرآن ہے۔ اس کے بعد قریب سولہ صفحات پر اس کی وضاحت کی ہے۔ اور پھر آخر میں کہا ہے کہ "ہم صدرِ مملکت اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جناب جنرل ضیاء الحق سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ..... وہ یوم آزادی کے موقع پر یہ اعلان فرما دیں کہ۔

آج سے ہم قرآن کو اپنا دستور ماننے کا اعلان کرتے ہیں، اور ہماری مبنی بھی انفرادی، اجتماعی، حکومتی کوششیں اور تدبیریں ہوں گی وہ اس منشور اسلام کے فروغ کے لئے ہوں گی۔

یہی بات طلوعِ اسلام کہتا ہے تو اس پر یہی حضرات کفر کا فتویٰ چسپاں کر دیتے ہیں! یہ اس لئے کہ طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا ہے اس پر قائم رہتا ہے۔ اور یہ حضرات ..... وہ محدث نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ قرآن خالص کے کس قدر پابند ہیں۔

تبلیغ اسلام کے نتائج!

لندن (نمائندہ جنگ)۔ آج پولیس نے دو مختلف جگہوں سے (۱۵) پاکستانیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان پر مقامی مسجد

میں ہونے والے فرقہ وارانہ جھگڑوں میں ملوث ہونیکا الزام ہے۔ ٹیلی فورڈ میں (۱۲) افراد کو گرفتار کیا گیا جہاں فرقہ وارانہ جھگڑے میں (۱۲) افراد زخمی ہوئے اور پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ جبکہ ایگزیٹر روڈ کی مسجد میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان خوں ریز تصادم کے بعد پولیس نے تیرہ افراد کو گرفتار کر لیا۔ یہاں (۱۲) افراد کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ (روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء)

ابھی تو یورپ میں (جدید) تبلیغ اسلام (فنڈامینٹل ازم) کی ابتدا ہوئی ہے ـــــ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

شرعی سزائیں

روزنامہ جنگ (لاہور) کے ملی ایڈیشن بابت ۲۳ جولائی ۱۹۸۳ء میں نمائندہ جنگ کا مولانا عبدالمالک صاحب کے ساتھ ایک انٹرویو کی روئداد شائع ہوئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

س۔ آجکل یہ بحث چل رہی ہے کہ اسلامی سزائیں اس معاشرے کے لئے تھیں جو براہ راست قرآن کی مخاطب تھی اب ان سزاؤں میں اجماع امت کے ذریعے تبدیلی کی جاسکتی ہے اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج۔ سزاؤں میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جاسکتی یہ ہر دور کے لئے مقرر ہیں قرآن کا مخاطب ہر دور کا معاشرہ ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ان سزاؤں پر مؤثر عمل درآمد اسی وقت ہو سکتا ہے جب پورے معاشرے کو اسلام کے قالب میں ڈھال دیا جائے اس لئے کہ اسلام جرائم کو صرف سزاؤں کے ذریعے ختم نہیں کرنا چاہتا بلکہ برائی کے خاتمے کے لئے عقائد اخلاق اور کردار کی اصلاح کر کے انہیں مثالی بنایا جائے معاشی اور معاشرتی نظاموں میں درستگی پیدا کر کے جرائم کا خاتمہ کرتا ہے۔ جب یہ ساری تدابیر کسی پر غیر مؤثر ثابت ہوں اور اس کے بعد بھی وہ جرم کا ارتکاب کرے پھر اس کو سزاؤں کے ذریعے سے درست کیا جاتا ہے اس سلسلے میں امت کا اجماع ہو چکا ہے۔

سود کیا ہے؟

اگلا سوال یہ تھا کہ سیونگس اکاؤنٹ سے جو زکوٰۃ کاٹی جاتی ہے، وہ سود کی رقم ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں مولانا صاحب نے فرمایا:

ج۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ رقم سود کی ہوتی ہے کوئی رقم بھی اس وقت تک سود کی نہیں ہوتی جب تک اسے بطور سود وصول نہ کر لیا جائے وصولی کے بعد ہی وہ رقم سود بنتی ہے وصولی سے پہلے وہ بنک کی ملکیت ہوتی ہے اسے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنک اپنے پاس سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے جب کوئی شخص یا ادارہ کسی کے مال کی زکوٰۃ اپنے مال سے دے تو اس وقت اس کی ادائیگی معتبر ہوتی ہے جب صاحب مال نے اسے اپنا وکیل بنایا ہو اور اس کو اجازت دے دی ہو۔

اسے آپ کیا کہیں گے؟ عدم واقفیت یا فقہ کی کتاب الحیل!

کمائی اور مہنگائی

ملازمین سرکار کی طرف سے مسلسل شکایات کے جواب میں ایک گوشے کی طرف سے کہا گیا کہ ان کی تنخواہوں میں اس قدر اضافہ ہوا ہے۔ یہ پھر بھی شکایت کرتے ہیں۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے بعض لوگوں نے لکھا کہ تنخواہوں میں اضافہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی تو دیکھئے کہ اس کے مقابلہ میں مہنگائی کس قدر ہوئی ہے؟ اس سلسلہ میں، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۷ جون ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں، ایک صاحب کا بڑا تفصیلی مقالہ شائع ہوا ہے، جس میں (علاوہ دیگر امور) یہ بتایا گیا ہے کہ اشیائے خورد کے نرخوں میں ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۱۹۸۳ء میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ ہم ان میں سے دو چار اشیاء کے نرخوں کو درج ذیل کرتے ہیں:۔

جنس	نرخ ۱۹۳۹ء	نرخ ۱۹۸۳ء	مہنگائی میں تناسب
آٹا	ایک روپے کا (۱۶) سیر	دو روپے کا ایک سیر	(۳۲) گنا
چاول	ایک روپے کا (۴) سیر	سات روپے کا ایک سیر	(۲۸) گنا
گھی دیسی	ایک روپے کا ایک سیر	(۳۵) روپے کا ایک سیر	(۳۵) گنا
دودھ	ایک روپے کا گیارہ سیر	(۴) روپے کا ایک سیر	(۴۴) گنا
گوشت	پانچ آنے فی سیر	(۲۶) روپے فی سیر	(۸۳) گنا
لٹھا	(۴) آنے فی گز	(۱۰) روپے فی گز	(۴۰) گنا
(آخر میں) ۔ کفن دفن	- (۷) روپیہ فی مُردہ	(۷۰۰) روپیہ فی مُردہ	(۷۰۰) گنا

ہماری نئی نسل (جو ابھی ابھی جوان ہوئی ہے) ۱۹۳۹ء کے نرخوں کو افسانہ سمجھے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ صاحب مقالہ نے بعض اشیاء کے نرخوں میں کچھ رعایت سے کام لیا ہے۔ ان کا نرخ اس سے بھی کم تھا۔ اور تقابل کے لئے بھی انہیں اٹھا پیچھے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دس بارہ سال قبل کے نرخ بھی سامنے لے آئے جاتے تو معاشرہ کی اقتصادی حالت کا اندازہ ہو جاتا۔

اصل یہ ہے کہ مہنگائی جس تسلسل سے بڑھتی چلی آرہی ہے اس نے ہمارے اندازوں کا تصور بدل دیا ہے۔ پیاز (مثلاً) چھ روپے کلو ہے تو باورچی خانہ سے آواز آئے گی کہ یہ اس قدر مہنگا ہو گیا۔ ابھی پچھلے مہینے چار روپے کلو تھا۔ یعنی اس کے نرخ میں دو روپے کلو کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اگر پچھلے ماہ کے بجائے پچھلے سال کا نرخ یاد ہو تو نظر آئے گا کہ اضافہ چھ گنا ہو گیا ہے۔ اس کا اندازہ وہ گھرانے کر سکیں گے جن کی آمدنی متعین (STATIC) ہے۔ وہ جسطرح زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اس کا اندازہ "بڑے لوگ" لگا ہی نہیں سکتے۔ جن کے لڑکے، سو سو روپے روز کے سگریٹ پی جاتے ہوں، وہ کیا جانیں کہ ایک سفید پوش "دیانتدار" اپنے بچے کو سکول کس مشکل سے بھیجتا، اور اپنی بیوی کا علاج کسطرح اپنی جان گردی رکھ کر کراتا ہے۔

تمہیں خاکساروں کی کیا خبر، کبھی نیچے اترے ہو بام سے؟

جرائم کی صورتِ حال

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۴ جون ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۰ء جنوری سے ۱۹۸۲ء دسمبر کے تین سالوں میں ملک بھر میں قتل کے چودہ ہزار ایک سو پچاس مقدمات درج ہوئے جبکہ مجموعی طور پر جرائم کے پانچ لاکھ چار سو نو واقعات ریکارڈ کیے گئے۔ اغوا کے مقدموں کی تعداد گیارہ ہزار دو سو اڑتالیس رہی جو گزشتہ تین سالوں۔ یعنی ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۸ء دسمبر تک کے مقابلہ میں ایک ہزار ایک سو دس زیادہ تھے۔

ڈکیتی کی وارداتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ اس طرح مجموعی طور پر ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۲ء کے دوران مختلف نوعیت کے جرائم میں (۸) سے (۲۰) فی صد تک اضافہ ہوا۔ تاہم ۱۹۷۹ء میں جرائم نسبتاً کم ہوئے واضح رہے کہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۸ء کے تین سالوں کے دوران قتل کے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء کے تین سالوں کی نسبت دو ہزار مقدمات کم درج ہوئے تھے۔

ہمارے کل کے علماء کرام!

پہلے تو ہمارے مختلف مذہبی فرقوں میں آپس میں جوتیوں میں دال بٹا کرتی تھی جب سے انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے، ایک ہی فرقہ کے اندر، مختلف پارٹیوں میں جوتم پیزار شروع ہو گئی ہے۔ قوم کو اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس لڑائی جھگڑے میں وہ ایک دوسرے کا نقاب نوچتے ہیں تو ان کی سیرت و کردار کی اصلیت قوم کے سامنے آجاتی ہے (مثلاً) آجکل فرقہ اہلحدیث کی دو پارٹیوں میں خوب چل رہی ہے۔ ایک کا ترجمان، گوجرانوالہ کا ہفت روزہ الاسلام ہے۔ دوسری کا نمائندہ، لاہور کا ہفت روزہ اہلحدیث۔ مؤخر الذکر کی یکم جولائی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں اوّل الذکر کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اس پارٹی نے ان کے دارالعلوم (جامعہ اسلامیہ، بند روڈ، لاہور) کے طالب علموں کو کس طرح اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ ہمیں نہ ان حضرات کی باہمی چپقلش سے کچھ سروکار ہے، نہ ان الزامات سے کچھ واسطہ جو وہ ایک دوسرے کے خلاف عائد کرتے ہیں۔ اہلحدیث نے ان (یعنی خود اپنے ہی جامعہ کے) طالب علموں کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

> دراصل یہ طلبا بری عادات اور حرکات کے مالک ہونے کی بنا پر سارق یعنی چور ثابت ہوئے۔ چوری کی بے غیرتی یہاں تک کی کہ اپنے ہی استاد کی گرم چادر ان طلبا نے چرا کر ساتھ ہی ایک ہوٹل والے کے پاس رکھ دی۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے گھڑیاں، کپڑے، جوتے اور دیگر اشیا چرائیں ..... میاں صاحب کی وسعتِ ظرفی اور نرم دلی ہے کہ انہوں نے ایسے بدمعاش طلبا کو معاف کر دیا ورنہ ان شریر، بدطینت، بدخصلت، رویل، کمینے، بے حیا، بے غیرت، اخبث ترین چور طلباء کی سزا قطع ید تھی یا یہ پولیس کے لائق تھے

آگے بڑھیئے!

> چونکہ یہ طلباء نااہل، نالائق، کند ذہن اور کمینے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے ہیں، اسی لئے ان کے والدین بھی ان کی سیاہ زبانوں پر لگام نہ دے سکے۔

یہ ہے نمونہ ان طالب علموں کا جو ہمارے دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور جو وہاں سے سندیں حاصل کر کے "علماء کرام"

بن جاتے ہیں اور شریعت حقہ کے اجارہ دار قرار پا جاتے ہیں۔

انہی کو دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!!

اور ہم خوار ہُوئے تارکِ قرآں ہو کر!

قرآن کریم کے صفحہ اوّل سے ورقِ آخر تک دیکھئے۔ اس میں حقائقِ کائنات اور نظامِ فطرت کے متعلق اس قدر رشد و ملدد تکرار و اصرار سے آئے ملے گا کہ یوں محسوس ہو گا گویا یہ کوئی سائنس کی کتاب ہے۔ اس نے انہی حقائق و قوانین کے مطالعہ کے بعد، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا، مومن کا شعار (بلکہ فریضہ) بتایا تھا جب تک قرآن ان کا قائد رہا، وہ علومِ سائنس میں کاروانِ انسانیت کے مشعل بردار رہے۔ جب دین مذہب میں بدل گیا تو علومِ فطرت کا حصول الحاد و بیدینی قرار پا گیا۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے محسنِ اول، سرسیدؒ نے قوم کی توجہ علومِ سائنس کی اہمیت کی طرف مبذول کرائی تھی۔ اس نے اس کے لئے نیچر (NATURE) کا لفظ استعمال کیا۔ آپ کو معلوم ہے علماء حضرات نے اس پر کیا کہا؟ انہوں نے سرسیدؒ پر کفر کا فتویٰ لگایا کہ وہ "نیچری" ہے۔ چنانچہ "نیچری" ایک فرقہ قرار پا گیا جس کی طرف منسوب ہونے والا ملحد و بے دین اور خارج از اسلام ٹھہرا دیا گیا۔ یہ اس مردِ آہن کا عزم بلند اور بے پناہ جرأت تھی جو اس نے ہمت نہ ہاری اور ان جھکڑوں اور آندھیوں کے باوجود اس شمع کو بجھنے نہ دیا۔ چنانچہ آج آپ پاکستان میں، دیگر تمام مسلم ممالک کے مقابلہ میں، کہیں کہیں علم و عقل کی روشنی اور روشن خیالی کے دیئے جلتے دیکھتے ہیں، تو یہ اُسی مردِ راہ بیں کی دور اندیشی کا تصدق ہے۔ لیکن یہ ایک فرد کی محدود سی کوشش تھی۔ بہ حیثیت مجموعی تمام مسلم ممالک میں علومِ سائنس شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ اس حد تک کہ آج مدینہ یونیورسٹی کا چانسلر یہ فتویٰ دیتا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ زمین گردش کرتی ہے اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اور اس کے تتبع میں پاکستان میں بعض لال بجھکڑوں نے یہ بحث چھیڑ رکھی ہے کہ زمین ساکن ہے، متحرک نہیں۔ انہیں تو چھوڑیئے۔ اپنے اخبارات کو دیکھئے جنہوں نے اپنے صفحات اس بحث کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ عیسائی پادریوں نے گیلیلیو کے خلاف یہی فتویٰ دیا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آج اس مقام پر ہیں جہاں یورپ چار سو سال پہلے تھا۔ وہ تو ان پادریوں سے پیچھا چھڑا کر چاند تک پہنچ گیا اور ہم ابھی تک ایک بند کمرے میں بیٹھ کر رویتِ ہلال کا شرعی فیصلہ کرتے ہیں! اس دور میں قوموں کی موت و حیات کا مدار بیشتر تسخیرِ فطرت پر ہے۔ جو قوم اس دوڑ میں ذرا پیچھے رہ جاتی ہے، وہ ذلیل و رسوا ہو جاتی ہے۔ اس میدان میں مسلم ممالک کا مقام کیا ہے، اس کے متعلق مشہور سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے اس مقالہ میں تفصیل سے بتایا ہے جو انہوں نے مئی ۱۹۸۳ء میں بحرین کے ایک سیمینار میں پیش کیا تھا اور جو روزنامہ پاکستان ٹائمز کی یکم جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے۔ ہم اس میں سے صرف اس تلخیص کو درج ذیل کرتے ہیں جس کا تعلق ہمارے زیرِ نظر موضوع سے ہے۔ اسے آپ غور سے دیکھئے اور سوچئے کہ ان حالات میں ہمارے زندہ رہنے کی کوئی صورت ہے! یاد رکھئے! جب تک مسلم ممالک پر مذہب مسلط رہے گا، اور قرآن کی حکمرانی نہیں ہو گی، ان کی یہی حالت رہے گی۔ جہاں یہ کہنا کفر و الحاد ہو کہ زمین متحرک ہے، وہاں آپ کیا ان قوموں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو عملاً ستارے چیر رہی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

پروفیسر عبدالسلام صاحب فرماتے ہیں:-

دنیائے اسلام میں علوم سائنس کی ریسرچ اور نشوونما کی صورت حال بڑی مایوس کن ہے۔ اس کا مقابلہ اگر غیر مسلم ممالک کے ساتھ کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے۔ (مثلاً) تمام عالم اسلام میں کل (۴۵،۱۳۶) سائنس کے ریسرچ سکالر اور انجینئر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں روس میں پندرہ لاکھ۔ اور جاپان میں چار لاکھ ہیں اسرائیل، جس کی آبادی مسلم ممالک کی آبادی کا ۱/۱۰۰ ہے، اس میں ۱۹۷۴ء میں (۲۴،۸۰۰) تھے جہاں تک فزکس (علوم طبیعیات) کا تعلق ہے، بین الاقوامی سطح پر مسلم۔ عرب ممالک جن کا رقبہ ۱/۱۰ ہے علوم سائنس کی تخلیق میں ان کا حصہ ۱/۱۰۰ ہے۔ پاکستان جو فزکس میں، تمام مسلم ممالک سے آگے ہے، اس میں (۱۹) یونیورسٹیوں میں فزکس کے صرف (۱۳) پروفیسر ہیں، اور تمام یونیورسٹیوں میں فزکس کے (۲۴۰) پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اس کے مقابلہ میں دولت متحدہ کی ایک یونیورسٹی کے ایک کالج میں (۲۱) پروفیسر اور (۱۰۰) ریسرچ سکالر ہیں۔ علاوہ ازیں، یہ حقیقت کہ سائنس کے میدان میں ہماری مساعی، بین الاقوامی سائنس سے بے رابطہ ہے، صورت حال کو اور بھی مایوس کن بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، مصر کے سوا، جو سولہ (UNIONS) کا ممبر ہے، کوئی بھی عرب یا اسلامی ملک علوم سائنس کے مختلف شعبوں میں پانچ بین الاقوامی سائنٹیفک (UNIONS) سے زائد سے مربوط نہیں۔

کیا "احمدی" مسلمان ہیں؟

ملت اسلامیہ ہندیہ کی سو سالہ کوششوں کے بعد، مملکت پاکستان نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیکر اس کاٹے کو جسد امت سے الگ کیا۔ لیکن اسی امت میں (بدقسمتی سے) ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں احمدیوں کا غیر مسلم قرار دینا بڑا ناگوار گزر رہا ہے، اور وہ کسی نہ کسی بہانے انہیں مسلمانوں کے زمرے میں شامل کرنے کی سعی مذموم کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال (کالعدم) جماعت اسلامی کے نمائندہ ماہنامہ ترجمان القرآن میں ملتی ہے۔ اس نے اپنی اگست ۱۹۸۳ء کی اشاعت کے اداریہ (اشارات) میں یہ بحث چھیڑی ہے کہ زکوٰۃ فنڈ کے سلسلہ میں اگر وسعت ظرف سے کام لیا جائے تو اس سے مستثنیٰ رہنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ یہ نکتہ ذرا لطیف سا ہے اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ زکوٰۃ آرڈیننس کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا۔ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۲۔ اس کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے لیکن ان میں سے جو شخص اپنے آپ کو شیعہ کہدے، وہ اس سے استثنیٰ حاصل کر سکتا ہے۔

یعنی غیر مسلم اس آرڈیننس سے مستثنیٰ ہیں۔ انہیں استثنیٰ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو مسلمان اس سے مستثنیٰ رہنا چاہیں انہیں استثنیٰ حاصل کرنی ہوگی۔

اس صراحت کے بعد دیکھئے کہ ترجمان القرآن اس باب میں کیا لکھتا ہے۔ اس نے لکھا ہے:-

اس سے یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے کہ کوئی قادیانی کہکر استثنیٰ حاصل کرے، کوئی خمس کی پابندی کی وجہ سے الگ ہو جائے۔

اور غیر مسلم عناصر تو ہیں ہی الگ۔

اس سے واضح ہے کہ ترجمان القرآن کے نزدیک قادیانی مسلمان ہیں جن پر زکوٰۃ آرڈیننس کا اطلاق ہوتا ہے اور انہیں (شیعوں کی طرح)

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

محترم پرویز صاحب
کے
درسِ قرآن
بذریعہ
VCR
کے

کوائفِ اوقات و مقام
متعلقہ
بزم ہائے
طلوعِ اسلام

کراچی (پاکستان)

ہر جمعہ ۹ ۱/۲ بجے صبح
دارالنوہرہ بالائی منزل
بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲۰
سرمد روڈ (کراچی صدر)

گجرات (پاکستان)

ہر جمعہ بعد نماز جمعہ
رہائش گاہ: ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب
جناح کالونی
(گجرات)

اوسلو (ناروے)

ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا سنیچر
شام ۶ بجے بمقام

MR MANZOOR AHMAD
DOVRE GATE - 7/ OSLO - 1

برمنگھم (انگلینڈ)

ہر ماہ کا پہلا اتوار
۲ بجے دوپہر

227/229 ALUM ROCK ROAD
38. 3BH (BIRMINGHAM)

دفتر ادارہ طلوعِ اسلام کے اوقاتِ کار

سنیچر تا جمعرات: ——— صبح دس بجے تا چھ بجے شام
بروز جمعہ: ——— صبح آٹھ بجے تا گیارہ بجے

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے:۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف: نوٹ: پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔
لاہور	ہر جمعہ ۱/۲ ۸ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۱
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱/۲ ۱۰ بجے صبح	76, PARK ROAD, ILFORD, TELEPHONE NO 553-1896
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFT WOOD AVE: #311, DOWNS VIEW. TORONTO (ONT.) M 3N-2P3, TEL: (416) 661-2827
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی بین صدر بالمقابل MAIN GATE PESHAWAR STADIUM (VIP) شیریں محل B. 3 یونیورسٹی ٹاؤن بازہ روڈ فون: (۴۲۵۹)۔
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبد اللطیف - محمود علی صاحب، اتمانخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۷۷ لیاقت روڈ
لیّہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان ۲۶۲۔ نظامی منزل
فیصل آباد	ہر جمعہ ۱/۲ ۳ بجے شام	بمقام۔ حیات سرجری کلینک، ۲۳/۷ پیپلز کالونی ۱ فون: (۴۲۸۵۱)
ہنگو	ہر جمعہ ۱/۲ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ۔ فون: (۶۷)
چوکی تحصیل کبیر والا (ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام: مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ - فون: (۳۱۰۷۱)
بہاول پور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ - عثمان پورہ، باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر۔ لوٹی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم۔ ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب۔ گلی روڈ (رسول ٹاؤن)
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ اور ہر اتوار ۳ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/۱-بی، جمیر روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلال پور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر ۲- ہر اتوار ۳ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب، واقع 294-K - کیہال (ایبٹ آباد) غلام مصطفیٰ اعوان صاحب واقع 350-K - گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)